

نیا سال اونٹنی اُننگ

دوستو - سال پلٹ گیا - اگر گزشتہ سال کو ہم نے رخصت نہیں کیا تو اس نئے سال کا خیر مقدم تو ادا کر دیں - اور ہم ہی پر موقوف نہیں - زمانہ کار رنگ ہی کچھ ایسا ہو رہا ہے - بے وفائی اور احسان فراموشی اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ اب زیر دست لے والوں کا استقبال جس دھوم دھام سے کیا جاتا ہے جانے والے اس سرگرمی و جوش سے رخصت نہیں کیے جاتے - اچلی شرافتوں پر خاک پڑتی جاتی ہے - وہ بے لوث اور بے خصوص کی محبتیں دنیا سے ہٹتی جاتی ہیں اور صرف منہ دیکھنے کی محبت اور غرض پرستی بچا کر رہ گیا ہے تو پھر عمارتی یہ فروگزاشت کہ مرحوم شہسوار کی رخصت میں ایک کلمہ بھی نہ سنے نہ نکالا اور نئے حکمران زمانہ شہسوار سے مرجا اور خوش آمد ہی کہنے لگے چاہے اگلے مرحوم و مغفور شرفا کے مذاق میں بد اخلاقی ہو مگر موجودہ زمانے کا رنگ دیکھتے بے موقع اور ناموزون نہیں ہے - ہماری حالت تو اب یہ ہو رہی ہے کہ یہ بھی غنیمت کہ کچھ خوف خدا کر کے سنہ گزشتہ کی شکایتوں کا دفتر نہیں کھولتے - اور اتنا خیال دل میں باقی ہے کہ مرے ہوؤں کا ذکر خیر سے کرنا چاہیے -

خیر اب ان باتوں کو چھوڑ کے نئے سال سے معافہ استقبال کرنا چاہیے - یوں تو اب قریب قریب ہر سال اپنے درود کے وقت کسی نے جشن طرب کا سامان کر دیا کرتا ہے - اور بعد چاہے جو کچھ ہو قحط ہو - طاعون ہو - آفت ہو - مصیبت ہو مگر ابتدا مزہ داریوں ہی سے ہو اُگرتی ہے یہی شروع سال کا زمانہ تھا جب ہم نے

اپنے شہنشاہ کا جشن تاج پوشی منایا۔ یہی موسم اور یہی دن تھے کہ پارسل اسی غیرتی رحمت مسلمانوں کی ابتدا میں ہم نے اپنے ولی عہد سلطنت برٹس آف ویلز کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اور اپنی حیثیت و حالت سے بڑھ کے جوش انبساط کا تماشا دیکھا اور دکھایا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جوش سرسبز یہاں تک بخود ہوئے کہ بعض حالتوں میں گھر بھونکے تماشا دیکھنے کو تیار ہو گئے۔ علیٰ ہذا القیاس غصہ بھی آتے ہی تاجدار اور دولت خداداد افغانستان ہر محبشی امیر حبیب اللہ خان دام اقبالہ کو اپنے ساتھ لایا۔ اور ہندوستان پھر وہی شروع سال کی کرشمہ سازیوں پر فریفتہ ہو کے اپنی خودی کو بھول جاتا ہے۔

شاہ کابل اقبالہ اللہ اے یوم القرار نے اپنے اخلاق۔ اپنی دینی سرگرمی۔ اپنی بے تعصبی۔ اور اپنی ذرہ نوازیوں سے یہی مبین کیا کہ اولیا و سلف کے بعض مزاروں پر نئی روتی آگئی اور مسجدوں کی چیل پیل یکایک بڑھ گئی۔ اور مسلمانوں میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ بلکہ ان کی رعایا پروری اور بے تعصبی نے ہندوؤں کو مسلمانوں سے زیادہ اپنا گردیدہ بنایا۔ اور مسلمانوں سے زیادہ جوش استقبال دکھانے کو ہندو تیار رہیں۔ اور کیا عجب کہ امیر کا یہ سفر ہندو مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کا ایک اعلا اور زبردست ذریعہ بن جائے۔ جس امر کی کہ امیر صاحب نے مختلف اوقات میں اور نیز اپنے طرز عمل سے بارہا کوشش کی ہے۔ ہندو مسلمان کے باہمی تعلقات چند روز سے بہت خراب ہو رہے ہیں اور روز بروز زیادہ خراب ہوتے جاتے ہیں اگر فرمان روا سے کابل جو باجوہ دھارے ایک پڑوسی تاجدار ہونے کے باوجود ہمشفق بن کے ہمارے وطن میں تشریف لائے ہیں اپنی یادگارین یہ اتفاق و اتحاد کی برکت ہم میں چھوڑ جائیں تو واقعی ہم بڑے خوش نصیب ہیں۔ اور یہ کہنے کو تیار ہیں کہ مسئلہ سے زیادہ اچھا اور مبارک برس ہندوستان کو صدیوں سے دیکھنا نہیں نصیب ہوا تھا۔

لیکن اگر اس اتحاد کو استقلال نہ ہو تو بھی اس میں شک نہیں کہ امیر کی آمد سے ایک بہت ہی بڑا اہم مسئلہ صفائی کے ساتھ ثابت ہو گیا۔ وہ یہ کہ انگریزی حکام نے تو ہمیشہ اتحاد و اتفاق کی حدیں نصیحت کی۔ مگر انگریزی موزنین نے اور خصوصاً ان مضمین

تاریخ نے جن کی کتابیں ہمارے مدارس تعلیم میں لازمی قرار دی گئیں ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عناد کا بیج بولنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی حالت دیکھ کے لوگوں کو قریب قریب یقین ہو گیا تھا کہ ان مصنفوں کا پورا جادو چل گیا۔ اور ایک ایسے اختلاف کی بنیاد پڑ گئی جو قیامت تک دور نہ ہوسکے گا اور ان کے پچھڑے ہوئے ابناءے وطن یعنی ہندو مسلمان اس عالم میں جا کے بھی شکیاں ساتھ مل گئے نہ رہ سکیں گے۔ یا تو ہمارے دلوں پر یہ اثر پڑا ہوا تھا۔ ہم اپنی طبیعت پر آنسو بہا رہے تھے۔ اور عیشہ کے لیے مایوس ہو گئے تھے یا ایک ایک حضرت امیر کے درود باجوہ کے ساتھ ہی وہ اندیشے ایک آن واحد میں کا فور ہو گئے۔ اور نظر آ گیا کہ اگر خوش قسمتی کی گھڑی آجائے تو یہ سارے جھگڑے کھڑے ایک آن واحد میں دور ہو سکتے ہیں۔ اور فتنہ پردازوں کا فتنہ ایسا نہیں ہے کہ دور نہ ہو سکے۔ غرض یہ اطمینان بھی بہت بڑی چیز ہے۔ اور ایسی چیز ہے کہ امیر کی آمد کو ہندوستان کبھی نہ بھول سکے گا۔

اب ہم ان رموز خسروان کو بھی چھوڑ کے اپنی طرف توجہ کرتے اور آپ بیتی سناتے ہیں۔ دلگداز کا انتظام سنہ ۱۹۰۷ء کے نصف اخیر میں نہایت خراب ہوا۔ اور پرچہ وقت پر نہ شائع ہو سکے۔ علی الخصوص اکتوبر نومبر اور دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء کے پرچہ فروزی سنہ ۱۹۰۸ء کی ابتدا میں شائع ہوئے۔ اس میں ابتداءً تو کاتب کے بدل جانے پہلے کاتب کے چلے جانے اور دوسرے کاتب کے دیرین دستیاب ہونے کو دخل تھا۔ اور بعد اُس کے خود ہماری اور سارے گھر بھر کی بیماری کو جس کے باعث ہم اکثر خطوں کا جواب بھی وقت پر نہ دے سکے۔ ہمارے قدر افزاؤں اور پُرانے دوستوں کو شکایاں تھیں۔ اور بجا شکایاں تھیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ دوستوں سے دوپلا شکایتیں معاف کر لینے کی ہمیں بھی اچھی مشق ہے۔

آغا خان صاحب کی لائف کا سلسلہ گذشتہ تین مہینوں میں ایک مجبوری سے روک دیا گیا۔ کیونکہ بعض حالات دریافت کرنے میں ہمیں دشواریاں پیش آئیں۔ اب ہم اس سلسلہ کو پھر شروع کر رہے ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ جلد ہی ختم کر دیں۔ بعض حضرات آغا خان صاحب کی لائف کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور اصرار کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ ناقابل چھوڑ دیا جائے۔

اگر نہیں - ہم آغا کی صاحب کو زنی و قہاست سے قطع معلق کر کے مجموعی طور پر بہت قابل قدر اور کھنوکھ کا فخر خیال کرتے ہیں - اور غرضوں سے جو زندگی بھر بجا رہا وہ انسان نہیں - ہر شخص کو اس طبقہ میں رکھ کے دیکھنا چاہیے نہیں وہ تھا - اور اس بات کا کلی طور پر کرنا چاہیے کہ اس کی ذات سے دینا لے کیا نفع اٹھایا -

۷ فلسفہ محبت

محبت این کار محبت چشم گریانی شستن
سوزش عشق درون دینہ پنداد
حضرات صوفیہ کرام جنھوں نے عشق حقیقی کے دشوار گزار مرحلوں کو طے کیا ہے فرماتے ہیں - العشق نازک بحر قیاسوے المہجوب - حقیقت اس قول کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا - انسان اپنے نین دھن کو مٹا کر اور دین و دنیا سے دست بردار ہو کر عشق کے دربار میں جا رو بہ کشتی کی خدمت حاصل کرتا ہے -

آتش عشق تو ام خمین پندار سوخت
تن جان دل وین حمد یکبار سوخت

کمان میں وہ شیدائی اور کمان میں وہ عاشق جن کے لیے جدائی کا وقت مصیبت اور تنہائی کا زمانہ آنت ہوتا ہے - اُن کے استقلال کے پائوں کے دوران کا دل شکیب و تحمل سے خالی وہ صبر سے بے بہرہ - اور ضبط سے محروم ہیں - اُن کا دماغ قیاس کی صحرانوردی - اور فرہاد کی کوکھ کی فرضی کہانیاں سننے سننے سے تنہا ہو گیا - حرص کی آگ مشتعل ہے خواہشات نفسی زور و ن پر ہیں وہ بجا رہے عشق کی جانشینی محبت کا مزہ اُلفت کا چٹخار کیا جائیں - آئین اور دیکھیں کہ ہماری ہجر کی راتیں اور فرقت کے دن کس فرحت و انبساط کے ساتھ گزر رہے ہیں - محبوب کی صورت دلیں نظر آ رہی ہے -

دل کے آئینہ میں تصویر بیاں
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی
اغیار کی غمازی سے مطمئن رقیب کی فتنہ پر دازی سے محفوظ بیٹھے چین کی
نیسی بجا رہے ہیں - کبھی دل ہی دل میں محبت اور پیار کی باتیں ہوتی ہیں کبھی
لڑائی جھگڑا دیکھیں ہے - ایک دُٹھا ہے تو دوسرا منار رہا ہے - ایک بناؤ

سنگار کر رہا ہے تو دوسرا دلیر ہاتھ رکھے تک رہا ہے۔ اور کچھ دہمی آؤ
سے کہ رہا ہے۔

اسی عمر میں سلامت ہو تم بھی قیامت میں مرا کوں تعین پڑو مجھے اجل نہ آئے
ذرا محبت کی نظر سے دیکھا گویا سلطنت ملگئی۔ ذرا ایڑھی جتوں کی کہ اعضا میں
تشیخ ہونے لگا۔ تھوڑی سی دیر گئے میں باہن پڑیں میں ایک دوسرے
کے محبت و پیار سے لطف اٹھا رہا ہے۔ کبھی منہ سے منہ ملا دیا کبھی خسار
سے خسار رگڑ دیا۔ ایک ایک کے پیشانی کی تو دوسرے نے گدگدایا ایک نے
کوئی خوش رنگ پھول دکھایا تو دوسرے نے ایک پتہ توڑ کر منکھایا۔
غیر کی صورت نظر آئی تو دونوں غلغلہ۔ ایک چپ تو دوسرا خاموش۔
سوج میں ہیں کہ کیا بات بنائیں۔ دل کی گھبراہٹ۔ حواس کا انتشار چہرہ
کا رنگ اڑائے دیتا ہے۔ آنے والا آنکھ سے اوجھل ہوا کہ بھروسہ یو باؤ
مگر اس دفعہ ہوشیاری کی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ ذرا پتہ
کھڑکا کہ پھر الگ ہو گئے۔ دائیں بائیں نظر کی اور وہی گھبراہٹ اڑنے لگی۔
آن کی آن میں خیال نے پلٹا دکھایا تو اکیلے پڑے تارے گن رہے ہیں
اور حسب حال کچھ اشارے جو یاد آئے تو گنگنا نے لگے۔ اے اللہ کے بندے
میری ایک بات سنو۔ اور حسنین کی تاک جھانکے باز آؤ۔ پس تحقیق محبت
کا انجام موت ہے۔ اور آغاز بھیل معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ تو رات
کی آخر شماری چھوڑ دے۔ اور اس اندھیری رات میں سورہ۔ میں کہتا
ہوں کہ میرے دل کو کیونکر چین آئے۔ جب تک کہ رات سے صبح نہ کر دوں
سما عا یا عباد اللہ منی و کفو عن ملاحظۃ الملاح فان الحب آخرۃ المنايا
داولہ شیعہ بالمزاج و قالوا دع مراۃ الثریا و نم باللیل مسو و الجناح
فقلت دل آفاق القلب ہے افرق بین یلی و الصبح
غرض کہ تڑپ تڑپ کر رات کا ٹی تو دن پہاڑ ہو گیا۔ جدھر جاتے
ہیں یار و اغیار کے وطن و تشنغ سانپ بچھو کا کام دے رہے ہیں۔ کچھ بڑا
خیالات و ماخ میں پیدا ہوئے کہ دل سے گئے لگے۔

جانے دے لے تصور جاننا نہ کرنا
ایسا سو کہ وہ کمین شمن کے گھر لے
تھا کہنا تھا کہ فتنہ وہی خیال دل میں آگیا کہ لو وہ تو قریب کا پہلو گرم گرم ہے
ہیں سراز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں - وقتاً فوقتاً ملنے کے وعدے ہو رہے
ہیں ہمارا ذکر آتا ہے تو پیشانی پر شکن آ جاتی ہے - بس اب بھینچی کا حال کچھ
پوچھے بیٹھے سے کھڑے ہو گئے - کھڑے سے چکر آیا تو سر پر کڑی ٹیچہ لگے -
دل باقیوں اچھل رہا ہے کچھ کو سون جا رہا ہے - چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا
بدن میں پسینہ آگیا - دم چڑھے لگا - حالت غیر ہو گئی - اس سے ذرا فرصت
ہوئی تو سی مجلس میں موجودین آنکھیں چاروں طرف سے اشارے ہونے لگے
دل ہی دل میں دے کہ کوئی دیکھ نہ لے اور کنکلیوں سے برابر سوال ہوا
ہو رہے ہیں - اگر اتفاقاً کسی کی نظر پڑ بھی گئی تو نظر چرائے - ذرات اس کر کے
دیکھنے والے کی صورت کو سرسری نظر سے دیکھا تو اس کو کسی اور طرف متوجہ
پایا کہ پھر نظارہ بازی شروع ہو گئی مجلس پر خاست ہوئی تو دونوں ایک
دوسرے کو دیکھتے چلے جا رہے ہیں - شوق کی قوت مقابلہ کی ایک دوسرے
کو کھینچ رہی ہے - مگر افشاں راز کا خیال دونوں کے فضل کو بڑھا دیتا
ہے - یہاں سے خیال بدلا تو وصل کی رات کا شمار پیش نظر ہے اب اس
سے زیادہ اور کونسا وقت قابل قدر اور قیمتی ہو سکتا ہے؟ گروہ دل کی
الچھن اور پٹھا پٹھا درد کب چین لینے دیتا ہے - اور صبح کا کھٹکا ہے کہ لگا
ہوا ہے گھبرا گھبرا کر کہہ اٹھتے ہیں -

شب وصل غریبان ہے مرے ہدم کسی چوچے
گر بیان سحر کو مانگ رکھنا دامن شب سے
غرفہ ایک کیفیت ہے جو انسان کو محو اور بنحو ذکر وستی ہے
خمار کا اتنا رنموت کا پیا لہ ہے جہاں روح نے جسم سے مفارقت کی
کہ نشہ ہرن ہو گیا - جس کو یہ سودا ہوا وہ اس کے دم کے ساتھ رہا - اس
میں بوڑھے جوان اور بچے کی تفریق نہیں - جس کو اس شراب کا دائمی سرور
حاصل ہوا اس سے معراج کمال کا درجہ پایا - جس نے اس راہ میں قدم
رکھا وہ منزل مقصود کو پہونچا - جس نے اس دریا سے ناپید اکنا رہیں غوطہ

لگا یا اُس نے گوہر مطلب پایا جس نے نفس کشی کی اُس کے حیات جاودا
 پائی۔ قلب صاف اور انجین روشن ہو گئیں۔ اُس کی خوراک ریاضت
 اور ورزش تزکیہ نفس ہو گیا۔ بوالہوسے کے بندے بد اخلاقیوں کے مشا
 عشق کو بدنام کرتے ہیں اُن کا نفس اُن کو ذلیل و خوار در بدر پھراتا ہے اور
 آخر کو ناشاد و فامراد بدنامی کے گہرے اور تاریک غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔
 نادان لوگ ایسے کشتگان ہوش کو شہد ناز سے تعبیر کرتے ہیں۔ بوالہوسوں کا
 عشق اُسی حد تک محدود ہے۔ جب تک جوانی کا جوش باقی ہے۔ اُس سے
 گذرے کہ ممنوعات شرعی سے محترز اور متنفر ہو گئے۔ اور نو جوانوں کے
 لیے دستور العمل بن گئے۔

اس لیے سچی محبت اور عشق وہی ہے جو خود غرضی اور خواہش نفسانی
 سے مبرا ہو اور تمام عمر دل میں اُس کی کھلب بانی رہے۔
 ہو جاتے ہیں دریاے محبت میں وہی پار تنکے کا بھی جو لوگ سہارا نہیں کرتے
 رانم م۔ ع۔ مقبول از علی گدھ

یاد وطن

وطن! پیارے وطن! تیرے دلفریب جہرے میں کیا کشتش ہے کہ
 کسی کی زلف گر گیر میں پھنسنے کے بعد بھی دل تیری طرف کھینچتا رہتا ہے۔ تیری سوا دین
 دیتی اور تیری آب و ہوا صحت بخشی ہے۔ اے شاد کا مان صحبت و وطن تم وطن
 کی قدر نہیں جانتے۔ جس طرح حسنینوں کا کوئی مقصد دور جانے والا اور حسنین
 کے مزے لوسنے والا نہ فراق کے مزے سے واقف ہے اور نہ معشوق
 کی سچی قدر جان سکتا ہے اُسی طرح تم بھی نہیں جانتے کہ غریب لوطی کتنی بڑی بلا
 ہے۔ اور وطن کیا چیز ہے۔

حضرت یوسف مصر کی مسند وزارت پر بیٹھ کے ارض کنعان کی گدائی
 پر حسد کرتے تھے۔ مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش ارض یہودا میں بچا
 کے خاندانی مقابر میں دفن کیا جائے۔ ورنہ انہوں نے اس وصیت پر عمل کرنا چاہا تو اہل

مصر نے سزا محنت کی۔ آخر مدت ہائے دراز کے بعد حضرت موسیٰ جناب یوسف کا تابوت لے کے آباؤ اجداد کی سرزمین میں پہنچے اور وہیں دفن کیا۔
سلکندروں و القرنین نے جب شہر بابل میں دنیا کو رخصت کیا ہے تو افسردہ کو وصیت کر دی تھی کہ میری لاش کو ارض یونان میں لیجا کے دفن کرنا۔

اس سے بھی زیادہ لطف کی یہ بات ہے کہ تاجدار عظیم شاہ پور ذوالاکتاف ایک مرتبہ رومیوں کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا تھا جو اسے اپنی حراست میں بلا دردمین لے گئے وہاں قید کی مصیبت میں مبتلا تھا کہ اسیری کے ساتھ بیماری سے بھی سابقہ پڑا۔ اتفاقاً شہنشاہ روم کی بیٹی اس پر فریفتہ ہو گئی۔ جو جوش محبت سے باپ کے قید خانے میں خود ہی جا کے صاحب تاج قیدی کی خدمت و تیمارداری کرتی تھی۔ جب مرض نے طول کھینچا اور کسی طرح افاق نہ ہوا تو رومیہ شاہزادی پوچھنے لگی اب آپ کی صحت کے لیے کیا تدبیر کی جائے؟ جواب دیا ”پیسے کو جلد کا تھوڑا سا پانی۔ اور سونگھنے کو اصرطخ کی تھوڑی سی مٹی ملا دو۔ چند روز بعد شاہزادی تھوڑا پانی اور تھوڑی سی مٹی لے کے آئی اور کہا ”لو یہ جلد کا پانی ہے اور یہ اصرطخ کی مٹی ہے“ گو شاہزادی نے اسے دھو کا دیا تھا اور ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی مگر محبت وطن کا جوش دیکھ کر محض دہم و گمان کی بنیاد پر اس پانی کے پینے اور مٹی کے سونگھنے ہی شاہ پور اچھا ہو گیا۔

اسی قدیم روایت کی برکت تھی یا ذاتی تجربہ ہوا تھا کہ ہر اکہ کے زمانے میں لوگوں کا معمول ہو گیا تھا کہ سفر پر جانے لگتے تو وطن کی تھوڑی سی ایک تھیلے میں بھر کے ساتھ لے کر لے آ کر تہ کہیں غربت میں بیمار ہوئے تو یہ خاک خاک شفا ثابت ہوگی۔ ایک دفعہ ایسی شخص کی زبان سے نکل گیا ”سفر عذاب کا ایک حصہ ہے“ دوسرے نے کہا ”یہ نہ کہو بلکہ عذاب سفر کا ایک حصہ ہے“

خود حضرت سرور کائنات صلعم کو اگرچہ مدینہ میں انصار کے سے جان نثار مل گئے تھے مگر مکہ کی یاد جب آتی دل دکھا ہی دیتی تھی۔ امان مکہ سے آ کے حاضر بارگاہ نبوت ہوئے تو آپ نے پوچھا ”کہ کو کس حال میں چھوڑا تھا؟“ عرض کیا ”میں جب جلاہوں اذخر (ایک گھاس) میں پھل آگئے تھے۔ اور تمام دایک خوشبودار مکہ کی گھاس) میں کو پھل پھوٹ چکی تھی“ وطن کی یہ خیالی تصویر دیکھتے ہی آپ کی آنکھوں

میں آنسو بھر آئے۔

موزن رسول اللہ جلال کو مکین زندگی کی بہت کم گھڑیاں چین اور آرام سے گزری تھیں۔ ہمیشہ سائے ہی گئے تھے۔ مگر جب مکہ کی یاد آتی تو یہ دو شعر پڑھنے لگتے۔

الالیات شعری بل بیتن لیلۃ
یواد وحو لی اذخرہ جلیل
کاش معلوم ہو جاتا کہ مجھے کبھی اُس وادی میں پھر بھی ایک رات کے لیے سونا نصیب ہوگا جہاں میرے گداذخرہ جلیل (مکہ کی دو گھانین) اُگی ہوئی ہوں؟
وہل اردن یو امیا ہجنتہ
وہل یبدون لی شامۃ طفیل
اور کبھی آبِ مجنہ پر پھر اُترنا ہوگا؟ اور کبھی شامۃ اور طفیل پہاڑیوں کی چوٹیوں پر نظر کے سامنے ہوں گی؟

وطن کی یاد جیسے ریچھین کر دیتی ہے وہ بچپنی اور کسی چیز کے یاد کرنے سے نہیں ہوتی۔ سواد وطن یاد آتے ہی خدا جانے کن کن لوگوں کی اور کیسی کیسی پیاری صورتیں نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ یارانِ وطن کا جلسہ خیال کے سامنے آتا ہے اور تڑپا دیتا ہے۔ اعزاء و اقارب عالم خیال میں غریب الوطن کے سامنے آتے ہیں اور اُسے اپنی طرف بلا تے ہیں۔ بال بچہ اپنے غم مفارقت کے واقعات اُسکی پُر حسرت نظر کے سامنے کر دیتے ہیں اور اُس کا دل قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔

مگر ان سب سے زیادہ کشش اُن گلی کوچوں کی ہوتی ہے جنہیں وہ بچپن میں پھرا تھا۔ اُن میدانوں کی ہوتی ہے جن میں گم بڑ کے اور کھیل کود کے وہ بڑا ہوا تھا۔ اُس شکستہ مکان کی ہوتی ہے جس میں اُس نے آغوشِ مادر کا لطف اٹھایا تھا۔ وٹا کوئی وجہ نہ تھی کہ غربت کی امارت میں انسانِ وطن کی فلاکت و محتاجی کو حسد کی نگاہ سے دیکھے۔ اور غریبِ وطن کی بادشاہی کو صحبتِ وطن کی فیکری پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ان وطنی جذبات کے غالب ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنا بچپن نہایت ہی عزیز ہوتا ہے۔ بچپن کی بے فکریاں اور ماں کا آغوشِ شفقت زندگی بھر یاد آ کے کسی دلربا نازنین کے خیال سے بھی زیادہ بچپن کر دیا کرتا ہے۔ اُس عہد کی

سادگیان اور حاقین بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور بچپن کا آغوش جس طرح مان کا گود ہے اسی طرح سواد وطن اور وہ مکان بھی مین جن میں اُس نے زندگی کی ابتدائی گھڑیاں بسر کی تھیں۔

چنانچہ اگر وطن کی باتیں زیادہ موثر الفاظ میں دکھائی جائیں تو انسان کے ارادے بدل جاتے ہیں اور سفر میں لاکھ نفون کی امید ہو جسے کر کے گھر میں بیٹھ رہتا ہو مشہور ہے کہ ایک بدوی عرب نے سفر کے لیے کمر باندھی۔ اور چلنے کو تیار ہوا تو بی بی کے پاس آیا اور کہا۔

عدی انہیں بغیتی و تبصری و ذری اشہور فائمن قصار

سیر غیبت میں برس کتنی رہنا اور مینوں کا لحاظ نہ کرنا کہ وہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ بی بی نے سنتے ہی ایک آنکھنچی اور جواب دیا۔

فا ذکر صبا بتنا ایک و شوقنا و ارحم بنا تک انہن صغار

یاد کرو کہ تمہارے بعد تمہارے فراق کا مین کیسا صدمہ ہو گا ہا اور تمہارا کس قدر شوق ہو گا ہا اور اپنی بیٹیوں پر رحم کرو۔ وہ ابھی ننھی بچیاں ہیں۔

یہ موزون جواب سنتے ہی بدوی کے دل پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ سفر سے باز آ گیا کہا "اب کون جائے!" اور کمر کھول کے گھر میں بیٹھ رہا۔ یہ مین یاد وطن کے کرشمے اور وہ ہے وطن کی کشش۔

عد و شہد سبب خیر گرد خواہد

کہتے ہیں کہ سلیمان بن عبد الملک جب خلیفہ ہوا تو محمد بن یزید نام ایک شخص کو والی عراق بنا کے بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں جاتے ہی جتنے قیدی ہوں سب کو چھوڑ دینا۔ اس لیے کہ حجاج بن یوسف کی سخت گیریوں نے صدمہ لوگوں کو ایسا بڑا کر رکھا تھا محمد بن یزید نے آتے ہی احکام خلافت کی تعمیل کی۔ اور پہلے والی یزید بن ابی سلم پر بہت جو روتشہد کیا۔ چند روز بعد جب خلیفہ سلیمان کی موت سے سرِ خلافت کو خالی کیا اور یزید بن عبد الملک اریکہ آراے سلطنت ہوا۔ تو اُس نے یزید بن ابی سلم کو افریقہ کا گورنر مقرر کیا۔ جہاں کی گورنری کی باگ اس سے پیشتر محمد بن یزید کے ہاتھ میں تھی۔

محمدؐ کو رنے جب ینرید بن ابی سلم کے آنے کی خبر سنی تو مارے خوف کے اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ کے روپوش ہو گیا۔ اور ینرید نے پہنچتے ہی اُسکی تلاش شروع کی۔ آخر وہ گرفتار ہو کے لایا گیا۔ اور جب وقت ینرید بن سلم کے سامنے پیش کیا گیا ہے رمضان کا مہینہ تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ اور ینرید کے ہاتھ میں انگور رکھا گیا تھا کہ اذان ہوتے ہی اُسے کھائے۔ محمدؐ بن ینرید کی صورت دیکھتے ہی بولا ”محمدؐ۔ تم میرا بولیا نے کی دعا مجھے مدت دراز تک مانگنی پڑی۔“ محمدؐ نے کہا ”اور میں بھی مدت دعا مانگ رہا ہوں کہ خدا مجھے آپ کے ہاتھ سے امان دلوائے۔“ سنتے ہی ینرید نے کہا ”امان بخدا کی قسم ندون گا۔ اور اگر ملک الموت بھی ارادہ کیا کہ میرا وارپرنے سے پہلے تمھاری جان نکال لے تو میں یہ انگور کھا ناچھوڑ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ عزرائیل کا ہاتھ پڑنے سے پہلے ہی تمھارا کام تمام کر دوں۔“ اُسکے بعد ینرید کے حکم سے اُس کی مشکینہ خدیجہؓ قتل کا مہینہ لاکے بٹھا دیا گیا۔ اور جلا دس کاٹنے کے لیے کھلوا رہے کے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں ہوذن نے اذان دی۔ اور ینرید بن ابی سلم وہ انگور کا خوشہ رکابی میں رکھ کے نماز پڑھنے کو گیا۔ اتفاقاً اہل افریقہ اُس کے دشمن ہو رہے تھے۔ نماز میں سجدے سے سر اٹھایا تھا کہ کسی بیباک دشمن نے ایک ایسا گز مارا کہ ایک ہی وار میں اُس کا کام تمام کر دیا۔ فوراً ہر طرف غل ہوا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ والی افریقہ مار ڈالا گیا۔ اور جلا دسنے جو کھڑا تھا اور قول رہا تھا محمدؐ بن ینرید کی مشکینہ کھول دیں اور کہا ”اب آپ آزاد ہیں جہاں چاہیے جائیے۔“ وہ انگور کا خوشہ رکھا رہ گیا۔ اور فرشتہ موت نے ایک آنکھ آنکھیں اس بات کا ثبوت دے دیا کہ وہ سبقت کر سکتا ہے یا وہ جو گھڑی بھر کے لیے خدا جل و علا کو بھول گیا تھا۔ یہاں سے نظر آتا ہے کہ خدا کی قوت سب پر غالب ہے۔ اور اُس کی مرضی کے خلاف ایک ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونہ مشیتِ ایزدی کے غالب آنے کا یہ ہے کہ سلاطین آلِ حمدان میں سے ملک انصار روح فرسا مرض قویج میں مبتلا ہوا۔ تمام اطباء دولت حاضر ہوئے۔ اور اپنی تدبیروں میں کوئی بات اٹھانہ رکھی مگر بادشاہ کو نفع نہ ہوا تھا نہ ہوا۔ آخر اطباء عاجز آئے کہ اسیانہ ہو بادشاہ ہماری یہ کمزوری دیکھ کے اور

ہم سے بدعقیدہ ہو کے ہمارے ازار کے دریے ہو جائے۔ چنانچہ سب نے اپنی جان بچانے کے لیے یہ تدبیر سوچی کہ بادشاہ کا کام ہی تمام کر دیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک شخص کو مقرر کیا جو خنجر کڑوں میں چھپائے ہوئے محل میں چھپ رہا۔ ملک الناصر یوان شاہی کے ایک حصہ سے دوسرے میں جا رہا تھا اور ایک دہلیز پر قدم رکھا تھا کہ اُس شخص نے نکل کے حکم کیا۔ اور ناف کے نیچے خنجر بھونک دیا۔ خنجر سے معاذ قونون چاک ہو گئی جس میں سڈون کے رُک جانے سے مرض پیدا ہوا تھا۔ فوراً تمام ماوہ فاسدا ورسک نکل گئے۔ اور قونون کی جان گزرا تکلیف سے ملک الناصر کو بجات لگئی۔ باقی رہا زخم وہ چند ہی روز میں جراثیم کی ہنرمندی سے اچھا ہو گیا۔

سچ کہتے ہیں کہ ۶۰ عدد دشوہ سبب خیر گرد خدا خواہد۔ وہی دشمنی جو زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے کی گئی تھی زندگی بخش ثابت ہوئی۔ اور جو حربہ جان لیوے کے لیے کیا گیا تھا اُسی نے جان بچا دی۔

ہمارا جدید ناول

ناول یوسف و خیمہ جو ایک مدت سے تمام مذاقص پڑا ہوا تھا مہجور ہو گیا۔ اور اس کا فیصلہ سبک کے ہاتھ ہے کہ انجام کیسا ہوا؟ اور اس کی کیا حالت رہی؟ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ناظرین نے اس انجام کو پسند کیا ہوگا۔ اور جو کچھ اس میں ہوا وہ اُن کے مذاق اور اُن کی خواہشوں کے موافق ہوگا۔

نئے ناول کے متعلق ہم کچھ زمانے تک متردد رہے کہ کس تاریخ اور کس عہد کو اختیار کریں۔ بعض حضرات کی خواہش تھی کہ غدر کا زمانہ اختیار کیا جائے۔ اور اس وقت کی مصیبتوں کی تصویر دکھائی جائے۔ بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ہندوستان ہی کی پرانی تاریخ میں سے کوئی زمانہ منتخب کر لیا جائے۔ دو ایک دوستوں نے پھر یورپ کی سیر کرنی چاہی۔ اور فرمایا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں سے ایک اچھا اور دلچسپ پلاٹ اخذ کر لیا جائے۔ لیکن ہم نے جہاں تک غور کیا انہیں سے کسی مشورے پر عمل کرنے کے لیے ہم ابھی تیار نہ تھے۔

نئے تعلیم یافتہ گروہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور رہائش

وطن کی فروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہیے۔ جیسا کہ انگریزی میں ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ اُن کی تابخربہ کاری ہے۔ بے شک انگلستان اور ممالک یورپ میں اکثر ناول ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور وہاں وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کی سبک میں جہاں تک میرا تجربہ ہے۔ یہ عنوان بالکل دلچسپ نہیں ہو سکتا ہے۔ افسانوں میں انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے اعلیٰ کو ڈھونڈھتا ہے۔ اور ناکامی و شرمے بڑی بھی پسند آتی ہے تو اسی عمدگی جبکہ اپنے حالات میں کامرانی و مقصد و رسی کی صورتیں نظر آیا کرتی تھیں۔ جس طرح ہر انسان اپنے جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا۔ اور مزہ لے لے کے کتا اور سنتا ہے۔ اسی طرح قومیں بھی اپنے عروج و کمال اور اوج و اقبال کے واقعات کو زیادہ پسندیدہ خیال کیا کرتی ہیں۔

یورپ والوں کو دنیا کی ساری عمر ہی اپنا ہی موجودہ دور کامیابی کا مگر اور ترقی و عروج کا دور نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی گزشتہ زندگی کے عوض موجودہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے اور قومی عمر کے اسی حصہ پر فخر و ناز رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اُن کے ناول موجودہ سوسائٹی کے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بلکہ بالکل جا سے ہے۔ بہ خلاف اُن کے ہم اہل ہند و یا مسلمان بلکہ میں کون کا کہ جاپان والوں کے سوا سارے اہل ایشیا۔ آئین عرب ہون یا ترک۔ ایرانی ہون یا ہندی یقین کر رہے ہیں کہ ہمارے اوج و عروج کا زمانہ گزر گیا۔ اور فی الحال ہم ایک نکتہ و پستی کی زندگی میں مبتلا ہیں۔ پھر ایسی حالت میں ہم پوچھتے ہیں کہ انھیں اپنی موجودہ زندگی میں لطفے لگایا اوج و اقبال کی زندگی میں؟

اور ہماری اس ذلت و پستی کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے جس میں ہم یا کسی کو کچھ مزہ آئے لگا؟ اوالعزمی و بلند حوصلگی ہم میں نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بڑے اہم معاملات ملکی و قومی نہ ہم کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ تعلیم و قابلیت ہم میں نہایت کم درجہ پر ہے۔ ہماری عورتیں جاہل اور نادان ہیں اور سوا پستی خیال کے اُن سے نہ کوئی علمی کام ہو سکتا ہے۔ اور نہ کوئی بڑا اہم ملکی

کام - شریف گھرانوں میں ہمارے یہاں - عشق نا جائز ہے - عقد سے پہلے مرد و عورت میں کوئی رابطہ نہیں قائم ہو سکتا - اور ہو تو نا جائز ہے - سچ یہ ہے کہ ہم میں سوسائٹی ہی نہیں جس پر یو آرپ کے ناولوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے -

رہن جند معمولی باتیں سپیل ہونا - کھیل کود کے بڑا ہونا - کچھ دنوں استاد کے سامنے بیٹھ کے محض بے نتیجہ اپنا اور اُس کا بھیجا خالی کرنا - شادی کرنا نہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھوں شادی کا ہوجانا - اور جند دنوں تک روٹی کی فکر میں بتلارہ کے اور زمانے کی سختی و سستی برداشت کر کے مرجانا - ہماری موجودہ زندگی کا خلاصہ اس میں اور ایک جانور کی زندگی میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے - اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان واقعات میں کسی کو کیا لطف آئے گا ؟

موجودہ سوسائٹی کے شوق کی برک سے اُردو میں ایسے بھی ناول لکھے گئے ہیں - جن میں کبھی کوئی شریف زادی کسی اور کے گھر میں ڈولی سے اُتر وادی گئی ہے - کبھی کسی نے کسی مہجین بھویشی کو کھڑکی سے جھانکتے - یا گاڑی کی تھیلیوں سے اُٹھیں مالتے دیکھ لیا ہے - اور عاشق ہو گیا ہے - پھر اُس کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی ہے - اور آخر اُسے خراب کیا ہے -

ایسے ناولوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ وہ سوسائٹی کی تصویریں ہیں یا اُن کے ذریعہ سے سوسائٹی اور زیادہ بدنام و رُسوا کی گئی ہے - اُن میں اخلاق کا سبق دیا گیا ہے - یا بد اخلاقی سکھائی گئی ہے -

سچ یہ ہے کہ ہماری زندگی اس قابل ہی نہیں کہ ناول کے صفحوں پر لائی جائے - اور جو کچھ اُس سوسائٹی میں ہے اگر دکھایا جائے گا اُس سے سوا اُس کے کہ ہم اپنی ذلت و تنہائی کو عالم آشکارا کر دیں اور کچھ نہ ہوگا - اُن کو پڑھ کر غیر ہم پر ہنسین گئے - اور ہم اُن سے جو سبق حاصل کریں گے وہ ہمیں اور ذلیل و پست کرے گا -

اور سب بڑی بات یہ ہے کہ موجودہ عشق پسند بھی نہیں آسکتا - کیونکہ اسی اصول کے مطابق جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی قومی زندگی کے اسی حصہ کے واقعات میں مرزا آسکتا ہے جو کامیابی و

عمر مچ کا زمانہ تھا۔ اور نصیحت و عبرت کے لیے بھی ہم انھیں اُن کے اوج و عروج کے کا رنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہوں گے۔

ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے بلکہ ”رواں“ چاہیے۔ جن میں انھیں کسی اگلے ہم وطن یا ہم مذہب کی اسٹے کار گزاریاں دکھائی گئی ہوں۔ اور جن کے ذریعہ سے انھیں اپنا اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو۔

ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش میں لکھ کے شائع کیے تھے۔ مگر بلبک کو اُن میں ہرگز اتنا مزہ نہیں آیا جتنا کہ۔ ملک الغر و خبا۔ فتح اندلس۔ ایام عرب۔ اور فردوس برین وغیرہ میں آیا۔ اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈ لیا کرتے ہیں۔ اور اُس میں موجودہ لٹریچر کے موافق جیسے کچھ مشریت ہوتی ہے۔ اور کچھ جیسے لامکاں و لچسپی پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ہمارے ناولوں کو لٹریچر مغربی و مشرقی انشاپردازی کا مجموعہ ہے اُسی طرح ہمارے ناولوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اُن میں کچھ انشائلیت ہو۔ اور کچھ یورپیت۔ نہ وہ بالکل ایسی بے سرو پا کہانیان ہوں۔ اور نہ انگلش گھروں کی تصویر دکھانے والے ناول۔

فی الحال ہم نے کوئی خیالی پلاٹ نہیں بنایا۔ بلکہ ایک ایسے عاشق عرب کا قصہ ناول کے پیرائے میں لکھنا شروع کر دیا ہے جس کے نام سے ہندوستان کے لوگ تو بہت کم واقف ہیں مگر عرب کے لٹریچر میں اُس کی حد سے زیادہ شہرت ہے۔ عاشق عرب میں سے مجنون عامری اور اُس کی معشوقہ لیلیٰ کا نام فارسی اور اردو نظم و نثر کا عنصرِ عظیم بن گیا۔ مگر قیس بن ذریج عذری اور اُس کی معشوقہ لیلیٰ کے حالات کے لوگ بالکل ناواقف ہیں۔ حالانکہ عرب میں ان دونوں ناموں کو لیلیٰ مجنون کے ناموں سے کم شہرت نہیں حاصل ہے۔ قیس بن ذریج کا کلام عربی لٹریچر میں کثرت سے موجود ہے۔ اس کے واقعات و موزن نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اور شعرا نے اُس کے سوز و عشق سے اپنے

ملاحظہ ہو غاشقانہ کلام میں گرمی پیدا کی ہے۔ اس کا زمانہ صحابہ کرام کا درمیانی زمانہ ہے۔ یہ اڈیر دگلدار حضرت عثمان ذی النورین۔ اور حضرت علی رضی کی شہادتوں کو اُس نے دیکھا کے تازہ ہنسن تو سنا تھا۔ اور اسلام کے اُس ابتدائی پُرفتن عہد میں تھا جبکہ حضرت رب العزت تصانیف خیر القرون کے برگزیدہ لوگوں کو آزمائش کی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اپنے منگو ایسے عشق کے جوش سے اُس نے اُس عہد کے جھگڑوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور نبی کی یوسف نجیہ یاد میں روایا کیا۔ اس کو سب سے بڑی فضیلت و شرافت۔ یہ حاصل تھی کہ حضرت امامین تام و کمال علیہ السلام کا رضاعی بھائی تھا۔

منین اس سے ہمارا ناول بے مزہ ہو جائے گا۔ اور واقعات کے معلوم کرنے کا جو شوق دلون میں پیدا ہوا کرتا ہے سرد پڑ جائے گا۔ لیکن اتنا اطمینان دلاتے ہیں کہ اس ناول میں جو واقعات بیان کیے جائیں گے مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہوں گے۔ ہاں ناول کی ضرورت سے تفصیلی مضمون اور محبت کی باتوں میں تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے نہ ناول ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصہ میں مزہ آ سکتا ہے۔

شائقین کتب کو مژدہ

مندرجہ ذیل کتابیں و مژدہ دگلدار سے مندرجہ ذیل مشترکہ قیمت پر منگوایئے۔
 پڑھیے۔ اور مزہ لیجیے۔ رضا حسینہ عمر۔ عمر پاشا علی۔ شہنشاہ عیاران۔
 عمر۔ عیارون کا عیار علی۔ فسانہ مفتوحہ و الجبر علی۔ روزا طبرٹ علی۔
 مارگرت علی۔ خوش نصیب عمر۔ مرد میدان ہر دو حصہ کامل للعر

المشتر۔ نیچر دگلدار

الحکام و رفایع
 ۳۰
 نیچر دگلدار

ہم اور ہمارے اسلاف

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے یہ قصہ ہے جب کالہ تشریف لیا تھا
تخلیق عالم سے اس وقت تک یہی قاعدہ چلا آیا ہے کہ اگر ایک قوم کے عروج کا آفتاب
سپہکال پر پہنچ کر غروب ہونا شروع ہوا تو اُسکے مقابلہ ہی میں دوسری قوم کا کوکب اقبال ترقی
کے بلند آسمان پر چمکنے لگا۔ متلوں زمانہ نے اسی طرح دنیا کے اسیج پر سیکڑوں دلکش ڈرامے
بنائے اور اہل عالم کو انکا تماشا دکھا دکھا کر ڈالا۔ بس یہی حالت مسلمانوں کے عروج
اور زوال کی ہے۔

دنیا میں سب سے پیشتر ہندوین ترقی کا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ بعد ازاں مصر۔ یونان۔
روما۔ کارتھج اور فینیشیا وغیرہ مختلف قوموں اور ملکوں میں یہ تیر و درخشان اپنی روشنی
ڈالتا رہا مگر جو وقت مذکورہ الصد رحمالک اس جگہ راسوخ سے متقیس ہو رہے تھے
اس وقت بلکہ اُس سے بھی کہیں پہلے سے عرب سخت پستی کی حالت میں تھا اور جب اُس
لا تعد از زمانہ کے گزرنے کے بعد اس ملک کے ہونا رفیقوں اور جنگجو قبیلوں نے کلمہ توحید
کی چونکا دینے والی آواز سے اپنے میں کوئی غیر معمولی اثر پایا تو فوراً ہی گناہی اور جہت
کے مجہول لباس کو اتار کر تمام دنیا پر اپنی جودت طبعی اور ذکاوت ذہنی ظاہر کرنے
کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس وقت مصر و یونان وغیرہ ممالک کی ترقی بدرجہ کمال پہنچ
کر زوال پذیر ہو چکی تھی۔ یاد دوسرے معنی میں ان جہان غم میں جو تیل ڈال گیا تھا وہ قیر
الافتخار تھا اور ان میں جو نعماتی ہوئی روشنی باقی رہ گئی تھی اُسکے لحاظ سے صرف

چراغ سحری ہی کہے جاسکتے تھے۔

ایک عرصہ تک اہل عرب قومی صلاح اور خانہ جنگیوں کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے اور جسوقت قومی خورسریزوں اور طوائف الملوکیوں سے فانی ہوئے تو انھوں نے فضا و عالم کا چکر لگانے اور مقصد عجم کو اپنی جولانگاہ بنانے کا مصمم قصد کر لیا۔ انھوں نے ذاتی شجاعت و استقلال اور خدا کے بھروسہ کے باعث یہ بھی خیال نہ کیا کہ ہم قلیل التعداد ہیں اور اس صورت میں ہم کبھی حملہ آور ہونے کی قوت و قدرت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے ریگستانی ملک کا کلمہ توحید کا رسالہ اور سلامی اخوت و یکدلی کا توشہ بھروسہ لیکر نکلے اور سیکڑوں کوس کا سفر کر کے اُن پوری طاقت رکھنے والی دور دراز ولاؤتوں پر حملہ آور ہوئے اور لطف یہ کہ اُن کو فتح ہی کر کے چھوڑا اور صرف اپنی ممالک کو فتح نہیں کیا بلکہ بہت دور دور تک اپنی تلوار کی دھاک بٹھادی اور فلا دی نیزوں کا لوہا منوا دیا جسکا اثر یہ ہوا کہ وہ جس جگہ گئے تھوڑی سی کوشش و بہت کے بعد اُن کے لیے باب فتح واہو گیا۔

جسوقت عربی افواج قاہرہ افریقہ کے میدانوں میں برابر اور مراکش اقوام بہت دست و گریبان تھیں اسوقت عنان سلطنت بنی امیہ کے ہاتھ میں تھی اور اُن کا مستقر خلا شام کا مشہور شہر دمشق تھا مگر چونکہ ابھی زمانہ سلطنت ابتدائی تھا اور خلفاء بنی امیہ کو ابھی فتوحات کے صلح کرنے سے اسقدر فرصت نہ ملی تھی کہ وہ علم فضل کی جانب توجہ کرتے مگر علمی ترقی کا دروازہ عرب میں بنی عباس کے زمانہ سے وا ہوا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ ایک طرف تو کوہ ہند و کش تک پہنچ چکا تھا اور دوسری جانب افریقہ کے اکثر حصص فتح ہو کر کاؤنٹ جولین کی مدد سے یورپ کی زبردست سلطنت ہسپین (انڈس) بھی مسلمانوں کے تصرف میں قریباً کل آچکی تھی کہ خلیفہ مذکور کا انتقال ہو گیا۔ گواؤس کے بعد کئی فرمان روا ہوئے مگر نا اتفاقی و لون میں جڑ بکڑی گئی۔ جسکا نتیجہ ہوا کہ سلطنت کے شیخ براہنجاہ و جلال دکھانے کے لیے بنی عباس نظر آنے لگے۔ اور آخرش انہی کی حکومت بھی قائم ہو گئی۔ انھوں نے عروس دمشق کو لوٹ کر بغداد کو وطن بنالیا اور اُسی کو مستقر الخلافت کا اعزاز و لقب بخشا۔

چونکہ بنی عباس ظنی طور پر علم و دست اور علما کے قدردان تھے اس لیے اُن کے زمانہ میں مختلف علوم کی بہت الجھی طرح تحقیق و تلاش ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں بغداد

سے وجہ کی طرح ایک اور دریا علم و فضل کا بننے لگا اور تھوڑے ہی زمانہ میں اسکے گرد دور دور سے آنے والے تفسیر لبان علم کا جوم ہو گیا۔ بنجوائے اناس علی دین موبو کم چونکہ بادشاہان وقت علم دوست ہوتے تھے اسلئے بغداد کا بیچہ تحصیل علوم کا شائق اور اسکے ذریعہ سے کامیابی و نام آوری کا خوابان نظر آتا تھا اور جن علوم کی طرف بادشاہ وقت کی توجہ خاص طور پر ہوتی تھی اسکی زیادہ ترجیحان میں کی جاتی تھی۔ خلفاء عباسیہ کے وقت میں شمشیر اور علم دونوں کو بے انتہا وسعت دی گئی تھی۔ جہان داری اور ملک گیری کے اصول گودہ خوب جانتے تھے۔ علم کے بہت بڑے قدر دان تھے عام اس سے کہ تحقیقی ہویا طبعی کسی مسلمان کی جودت طبع کا نتیجہ ہویا کسی غیر قوم کی ذہانت کا۔

جسوقت نبی امیہ کی سلطنت دوبارہ اندلس میں قائم ہوئی ہے اسوقت بغداد و حرمہ علوم اور مرکز فنون مانا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ علم ہیئت۔ ہندسہ اور فلسفہ کے بے حد شائق تھے مگر ایسا بھی نہ تھا کہ انکی معلومات کا دار و مدار انہیں ہر سہ علوم پر ہو۔ بلکہ وہ ہر علم کا جانتا اور اس میں نکات پیدا کرنا فرض عین سمجھتے تھے۔ کوئی شعبہ علم کا ایسا نہیں جسے مسلمانوں کی تحقیق کا بہتہ نہ چلتا ہو۔ اور جو یورپ کی موجودہ ترقی کا زبردست مددگار نہ بناتا ہو رہا ہو۔ اگر ان مشہور زمانہ اشخاص کے نام اور کارنامے (جو بلاد اسلامیہ میں گذرے ہیں) بالتفصیل لکھے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی مگر میں اس مختصر مضمون میں طوالت سے کنارہ کش ہو کر بہت ہی اختصار کے ساتھ اکثر اسلامی مشاہیر کی طبع آرائیوں اور ایجادوں کا ذکر لکھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو مسلمان آج دنیا کی نگاہوں میں عضو معطل اور ناکارہ محض ثابت ہو چکے ہیں ان ہی کے اسلاف آج سے چند صدی قبل کیا تھے؟ اور یورپ آج جن علوم و فنون کے جاننے اور موجد ہونے پر فخر کر رہا ہے انہیں سے بیشتر حصہ کے جاننے والے اور موجد خود مسلمان ہی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ خود مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں سے کس قدر ناواقف ہیں؟ بخدا انہیں مشکل سے یقین آئے گا اگر ان کو یورپ کے اختراعات کے مقابلہ میں بتایا جائے کہ فلان فلان چیزیں خود تمہارا ہے ہی بزرگوں کی ایجاد کردہ و تحقیق شدہ ہیں۔

مسلمان اپنے اسلاف کے اہل کارناموں سے زیادہ تر عربی تعلیم کے ہی ذریعہ سے واقف ہو سکتے ہیں مگر اول تو بدقسمتی سے عربی کی تعلیم کا رواج ہی کم ہوتا جاتا ہے اور اگر

کچھ ہے بھی تو اچھل کی عربی تعلیم صرف محدود سے چند علم پر محدود کر دی گئی ہے اور ان علوم سے فارغ تحصیل ہونے کے بعد چونکہ طلباء عام طور پر عالمانہ شان پیدا کر لیتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک دنیاوی علوم کا دیکھنا فضول ہی نہیں بلکہ گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے اسی لیے ان کی معلومات بھی مذہب ہی تک محدود رہتی ہے اور یہ تاریخ سے محض ناواقف اور گورے رہتے ہیں۔ اگر یہ تاریخ کی میر کریں اور اساتذہ سلف کے علمی کارنامے غائر نظر سے دیکھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو انکو معلوم ہو جائے کہ ہم کیا ہیں اور ہمارے اسلاف کیا تھے؟

ہندوستان کے اکثر مسلمان علم ہیئت اور فلسفہ کے سخت مخالف ہیں۔ اور وہ اسکا جانا خلاف مذہب سمجھتے ہیں۔ گو ایک حد تک ان کا خیال ٹھیک ہے کیونکہ فلسفہ کی باطل تعلیم مذہبی عقائد میں بہت بڑا فتور پیدا کر دیتی ہے مگر یہ قصور تعلیم کا ہو گا نہ کہ علم کا۔ شائد وہ مینن جانتے کہ خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ و منطق کو کھٹاب تعلیم میں شامل کیا تھا اور خود خلفاء ان علوم کے اسقدر مشتاق تھے کہ ابھی کوئی کتاب اس علم کی مصنف کے زیر قلم ہے مگر انھوں نے خبر پاتے ہی فوراً مغلط اور زرقہ بھیج کر خوش کی کہ کتاب کا سب سے پہلا نسخہ شاہی کتب خانہ میں بھیج دیا جائے۔

علم ہندوستان میں عربوں نے نمایاں ترقی کر کے حکماء یونان کی گرفت کی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ البسطانی نے بطلمیوس کی غلطی نکال کر سال کو ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۲۴ سکند پر قائم کیا اور کس کے بعد میں بطلمیوس ہی کی ۱۰ ڈگری کی غلطی نکالی۔

ابوالید حمید محمد ابن رشد نے جسے انگریزی مورخ اوروز کہتے ہیں آفتاب میں داغ بیان کیے جسکی تصدیق ایک صدی بعد مسٹر ولیم ہرشل نے کی۔ سال کا اندازہ جو البسطانی نے کیا تھا انھیں بھی کچھ غلطی تھی اس کی تحقیق ثابت بن قمر نے کی یعنی ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۱۱ سکند پر سال قائم کیا۔

ابن یونس نے وقت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے کچھ بڑے دویم ایجاد کیا۔ دو بین جو عوام کے نزدیک ایجاد اور سب سے پہلے ابوالحسن نے بنائی تھی۔ تیاروں کی کیا حقہ کیفیت دیکھنے کے لیے جیسے سیویل میں سب سے پہلے رصد گاہ بنائی تھی جو آج تک گرجہ کے کام میں لائی جا رہی ہے

فلسفہ بغداد میں سلطنت کے ساتھ ہی ساتھ آیا اور جب تک بنی عباس کا دور نہ ہو وہ انھیں کے ظلِ حمانت میں پرورش پاتا رہا۔ اندلس میں فلسفہ کا دخل چھٹی صدی ہجری میں ہوا اور وہاں بھی اُس کی دُھریب صورتیں بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر چھوڑا۔ گو ابتدا میں عرب اور اسپین ہر دو جگہ پُرجوش فہمی پیروؤں نے بڑی سختی سے اُس کی مخالفت کی تھی مگر فلسفہ و انون کے استقلال نے بڑی متانت کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ کیا اور شاہی حمانت نے آخر انکو پورے عروج اور کمال پر پہنچا کے دم لیا۔ جس وقت مسلمانوں نے نہال فلسفہ کی خوشہ چینی شروع کی ہے اس وقت فلسفہ ارسطو کا دور دورہ تھا اور اُسی کی تصانیف سے کتب خانے پرستے گرد و نت ساسانیہ کے مشہور اور زبردست کتب خانہ میں (جہاں فلسفہ ارسطو کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا) آگ لگی نے سے بُوعلی سینا کے فلسفہ کو ترقی ہوئی اور اُسی کا فلسفہ فلسفہ ارسطو سمجھا جانے لگا۔ مگر بغداد میں ابتدا ہی سے ایک گروہ فلسفہ ارسطو کے خلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے امام غزالی ج کے وقت میں بہت زور کے ساتھ فلسفہ ارسطو کی مخالفت کرنی شروع کر دی تھی۔ گو پھر جوش فہمی مقتدا اب تک اُسی طرح مخالفت فلسفہ پر آمادہ تھے مگر امام غزالی نے جس وقت فلسفہ اور منطق کو نصابِ تعلیم میں داخل کیا تو اس جوش کی آگ کچھ دُفون کے لیے ٹھنڈی ہو گئی اور جب امام ندو نے رحلت کی تو امام رازی نے اُسکی مخالفت پیکر باندھ لی اور شاگردہ ابنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے مگر اُن ہی کے ہمعصر محقق طوسی نے فلسفہ کی حمانت کی اور محض اسی کی حمانت و تبلیغ کے لیے بغداد کو تاتاریوں کے ہاتھ سے تاخت و تاراج کرا دیا۔

فلسفہ کے مشہور عالم عرب، ہسپانیہ، اور ایران وغیرہ میں یہ اشخاص ہوئے ہیں :- ابن کاجہ - ابن طفیل - ابن رشد - بوعلی سینا - ثابت بن قریہ - عمر خیام حضرت امام غزالی اور محقق طوسی وغیرہم - ان میں سے اکثر کی تصانیف ایک لاکھ صفحوں سے بھی تجاوز کر گئی ہیں۔

کیمسٹری (کیمیا) کا محقق ایک مشہور شخص جابر نامی گزر رہا ہے جس نے سب سے پہلے گندک اور شوریہ کا تیزاب اور سیلاب کا مرکب بنایا۔ اُسکے بعد امام رازی نے جوہر

پتھراب جسے الکمل کہتے ہیں تیار کیا۔
لو علی سینا (جو شاہ طب کہلاتا ہے) نے طب کے بیشتر خزانے جمع کیے اور دینا کے لیے چھوڑ گیا۔ ابن ظہر نے جو اس فن کا دوسرا ماہر کامل تھا علی اور نظری طب میں حیرت انگیز دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ ابن بیطار یا البیطار نے جو علم نباتات کا اعلا و جہ کا جاننے والا تھا مشرقی ممالک بالخصوص ہندوستان کا سفر کر کے ہزاروں بوٹیاں اور ان کے خواص معلوم کیے اور ان کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ بعد ازاں ایک مشہور جراح تھا جلعکے ایجا د کردہ چند آلات جراحی بلا ترمیم آج تک استعمال کیے جا رہے ہیں۔

علم ہندسہ میں بل غریب مہارت تانتہ رکھتے تھے۔ ان کے مروجہ قواعد حساب آج تک بڑی خوبی سے مستعمل ہیں اور وہ کچھ ایسے عمل ہیں کہ ان میں ذرا سی بھی ترمیم و ترمیم کی گنجائش نہیں۔ علم ہندسہ کے ماہرین میں چند انخاص زیادہ نامور ہوئے ہیں جنہیں سے ابن موسیٰ اور البیرونی کا بہر سب سے اول ہے۔ ابن موسیٰ نے جبر مقابلہ اور علم المثلث کو ایجا د کیا اور البیرونی نے بھی بہت سے قواعد حساب مضبوط کیے تھے۔ موسیقی میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا تھا جو سوائے اہل ہنود کے ان سے قبل کسی کو حاصل ہو ہی نہ سکا۔ گو مسلمان موسیقی کو خلاف شرع خیال کرتے ہیں اور ایک حد تک یہ خیال ٹھیک بھی ہے مگر اسپین میں خلیفہ عبدالرحمن ثالث انصار لدین اللہ کے وقت میں خاص قریبہ میں موسیقی کا ایک بے بدست کالج تھا جہاں سیکڑوں طلباء تعلیم پاتے تھے اور خود خلیفہ موسیقی کا اسقدر شائق اور اسکے ماہرین کا اسدرجہ قدردان تھا کہ ظہر مان موسیقی کا استاد جیسیا سے اس کالج کے دیکھنے کے لیے اندس گیا ہے تو خود خلیفہ نے اسکا استقبال کیا تھا۔

انجینئری (معماری) اور جبرئیل میں وہ مہارت و دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کی تعمیر کی ہوئی عالیشان عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر آجکل کے بڑے بڑے سد یافتہ اور نامی انجینئری میں آجاتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کن کن ترائی سے تعمیر کی گئی ہیں؟ اسپین کے مشہور شہر قرطبہ میں جو بیل دریا سے وادی البکر تعمیر کیا گیا۔ ہے وہ آج تک اپنے نادر المثال کاربکروں کی صنعت اپنی شاندار دارسترہ محرابوں سے ظاہر کر

کے بڑے بڑے ماہران فن کو حیرت کے دیا میں غوطے کھلوا رہا ہے۔ ہمسایہ کے محلات شاہی میں جو قصور قصر الازہار۔ قصر العنقیین۔ قصر السور اور قصر التاج کے نام سے موسوم تھے آج تک اپنی مٹی ہوئی شان سے عظمت و برہنہ ظاہر کر رہے ہیں بالخصوص قصر دمشق جو ان میں اول درجہ تھا اور جسکو خلیفہ وقتے خاص وطن کی یادگار میں قائم کیا تھا اب تک تارخ دانوں کی نگاہوں میں اپنا خیالی منظر پیش کر رہا ہے۔

تاریخ مظہر ہے کہ بنیۃ الزہراء کا وہ قصر جسکو خلیفہ اعظم نے خاص اپنی بیاری بی بی زہراء کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ اس میں سب سے زیادہ عجیب چیز ایک حوض تھا جس میں ہر دم کے آبی جانوروں کی ساری تصویریں جا بجا کچھ اس طرح لگائی گئی تھیں کہ وہ بالکل حسی معلوم ہوتی تھیں۔ جامع مسجد قرطبہ جسکی آرائش میں یہیں کے جملہ اسلامی فرمان رواؤں نے حصہ لیا ہے آج تک باوجود تباہ و برباد ہو جانے کے اپنی عظمت و شان اور اس زمانہ کے ماہران فن کی کاریگری کو ابھی طرح ثابت کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی صنایعوں کے نمونے دیکھنے کے لیے دو روزہ ممالک میں کیون جاتے ہندوستان کے روضۂ تاج محل ہی کو لے لیجیے جو باوجود کئی صدیاں گزر جانیکے آج تک اُسی شان کے ساتھ آگرہ میں کھڑا ہوا خاندان مغلیہ کے عالی حوصلہ بادشاہ شاہ جہان کی اولوالعزمی کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ اصل خلاصۃ العجاہب اور نادرات روزگار کا مکمل نمونہ ہے۔ ہندوستان کا تو بچہ بچہ اس تاج العورات کے نام سے واقف اور اس کے دیکھنے کا بے حد شائق ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ ملک غیر کے باشندوں پر بھی اسکی خوبصورتی و صناعی نے کچھ کم اثر نہیں ڈالا ہے۔ روزانہ بیسیوں شاہ مخمف بلاد و ممالک بعید سے صعوبت سفر جھیل جھیل کے خاص اس کے دیکھنے کو آگرہ آتے ہیں اور اس سراپا صنعت روضہ کی سیر سے حظ وافر حاصل کر کے واپس جاتے اور اپنے سفر کی کوفت کو رائگانہ نہ جاتے دیکھ کر اظہار مسرت کرتے ہیں۔

جب کوئی شخص اسکے عایشان و بلند بھاٹک میں روضہ میں داخل ہونے کے

لیے قدم رکھتا ہے تو نہر کے پاس سے گزرتے ہوئے اس تھوڑی سی مسافت
میں اسکو بے شمار دلچسپ سینریاں دکھائی دیتی ہیں جسکو مشاہدہ کرنے کے بعد بے اختیار
رکھنا پڑتا ہے۔ ۴ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست - لب جو چلتے چلتے جب
سیاح کی نگاہ سرو کے کشیدہ قامت درختوں پر پڑتی ہے تو کچھ دیر کے لیے اُسے
محو حیرت ہونا پڑتا ہے اور وہ بینن امتیاز کر سکتا کہ یہ دراصل سرو کے درخت ہیں
یا زمرہ کے جھاڑ اور جب نہر کے شفاف و خوش رنگ پانی میں سرو کے درختوں
عکس دیکھتا ہے تو سرو و روان کی نازک تشبیہ کا تجربہ بھی اُسکو بینن ہوتا ہے۔
نوازے جو نہایت خوشنمائی سے چھوٹتے ہیں رقم لباس معلوم ہونے میں اور ان کے
قریب ہی کھلنے والے گل لالہ لعل اور یا قوت رسانی سے کم حکم دمک بینن رکھتے
شائد اسی نظر فریب باغ کے لیے بیل شیراز نے ذیل کے اشعار تصنیف کیے تھے

رضتہ ماہ نہر با سلسال دوحہ جمع طیر ہاموزون

این پر از لالہ ہائے رنگارنگ دین بر از میوہ ہائے گوناگون

ایک جانب اگر قدرتی گھائی اور آبشار کی مصنوعی تصویر پتھر چل مناظر کا نقشہ
پیش نظر کر کے دلکشی زیادہ کر رہی ہے تو دوسری جانب فن باغبانی کی اسلئے
کا دیگر سے بنائی ہوئی روشیں بھی دلچسپی بڑھانے میں کسی سے کم نہیں۔ اگر ایک
طرف بیلا - ستونی اور چمپا کی بھینی بھینی خوشبو مشام جان معطر کرنے کی کوشش میں
ہے تو دوسری جانب یورپ کے رنگین ادا و دلفریب پھول بھی دیری میں یورپ
مشاق معلوم ہوتے ہیں۔ سنگ مرمر کے حوض کلان میں جو رنگین مچھلیاں چھوٹی مچھلی
ہیں دیکھنے والے کو بے طرح اسبات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ یہاں کی بھی ہو کر رہیں
اور بچوں پر تھوڑی دیر کے لیے ضرور بیٹھے اور ان کی خوش فیملیوں کا تماشا دیکھے۔
آگے چل کر جب سیاح شاہ جہان کے سفید و براق روضہ کے نیچے پہنچتا ہے
تو خود بخود اس کا دل مرعوب ہو جاتا ہے اور اُس کی چشم خیالی میں اس عالی حصہ
بادشاہ کے جاہ و جلال کی تصویر بھرنے لگتی ہے اور جب وہ اُس روضہ کے خصوصاً
صحیح قداور بلند میناروں - اُس کے شفاف فرش اور اسلئے پیمانہ کی پیرچیں کا
صنعتوں کو دیکھتا ہے تو اُسے ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں شاہان اسلام

سکے وقت میں ہی صنعت و حرفت معراج کمال پر پہنچ چکی تھی۔ انہیں قنات یاد سے مشابہت رکھنے والے مزاروں کو دیکھ کر کسی دل جلع عاشق مزاج کے منہ سے بے اختیار یہ کچھ بھین یہ پڑتا ہوا شعر نکل گیا ہے۔

یاد آ جاتا ہے اکثر لطف، سیرت گنج
دیکھنا مزاروں قدوں کے ساتھ وہ کیا کا
یوں کہ اول سے آخر تک یہ عمارت خوشنماں و رعنائی کی غنیمت تصور ہے مگر چند عین
اس میں بے نظیر رکھی گئی ہیں جن کا بیان خالی از وہی ہوگا۔ ان برج مثال کا ریکر یوں
میں اول وہ قرآنی سورتیں ہیں جو ہر محراب دار دروازہ پر ایک حصہ زیرین سے
شروع کر کے دوسرے حصہ پر ختم کی گئی ہیں۔ یہ محراب دار دروازے نہایت
بلند اور عالی شان ہیں جن میں یہ سورتیں بحفظ نسخ کندہ ہیں۔ ان میں یہ صفت رکھی گئی ہے
کہ جو حرمت اور جو لفظ جتنا بڑا اور جس پیمانہ پر پہنچے نظر آتا ہے اتنا ہی بڑا اور اسی پیمانہ
پر سب سے اوپر اور درمیان میں بھی نظر آئے گا۔

دوسری صنعت اس روضہ کا متمم بالشان بلند ہے۔ اس کی بلندی و رفت کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اوپر کا موجودہ پتیلی کس حصہ پر سونے کا طبع
کیا ہوا ہے اس گز طویل ہے مگر نیچے سے بالکل کسی تیز نظر آدمی کو سیام گز کا معلوم
ہوتا ہے عقل کا مہین کرتی کہ اس قدر بلند اور فنی کندہ و قبر دی حجت پر صرف تین
یا چار گز کی دیوار پر کس طرح قائم کر دیا ہے؟ اس کس میں جو نیچے سے بت چھوٹا نظر آتا
ہے تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر ۹ من چنے آسکتے ہیں۔

تیسری صنعت شاہ جہان اور اس کی چاہتی بی بی تاج محل کے مزاروں اور
اس کے گرد کے کھڑے پر کی ہوئی پرچین کاری سے عیاں ہوتی ہے۔ جس کو اگر عجوبہ
روزگار اور عظیم المثال کہیں تو زیبا ہے کیونکہ اس میں بڑی بڑی صنایع ہون اور
اس فن کی باریکیوں کو ختم کر دکھا ہوا ہے اور نگہ بین کے لیے دلچسپی جوں و جہا کی گنجائش
باقی نہیں رکھی ہے۔ جا بجا دیواروں پر رنگین پتھروں کے پھول تراش کر نصب
کیے ہیں اور اس صناعتی سے نصیب کیے ہیں کہ ان کا جوڑ بڑی جستجو کے بعد ہی معلوم نہیں
ہوتا۔ پھولوں میں جو پتیاں بنائی ہیں ان میں سے ہر پتی کی کئی رنگ کی ہے۔ اگر
پتی کا بالائی حصہ سبز پتھر کا ہے تو حصہ زیرین سرخ یا زرد رنگ کا اور لطف یہ کہ ہر

جی ہین رگین بال نچیل شکل کی بنائی ہیں جو بلا مبالغہ بال سے باریک ہیں اور سب سنگ مرمر کی ہیں مگر کیا مجال کہ ذرا سا بھی جوڑ معلوم ہو جائے یا وہ یاں سے باریک پتھر کی تراشی ہوئی رگین کسی جگہ سے خراب و بد فاد کھائی دیں۔ ان پھولوں کی حیرت انگیز صناعتی کا اندازہ آپ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں کہ ۷۲۔ اور ۷۳۔ ٹکڑوں کا ایک ایک پھول بنایا گیا ہے مگر ممکن نہیں کہ آپ اُن کے پیوست کردہ ٹکڑوں کو اچھی طرح شناخت کر سکیں۔ یہ سُن کر آپ کو یقین نہ آئے گا مگر عینی نظارہ میرے بیان کا بہت زبردست موید ہے۔ ہاں ہم جو سے کہتے ہیں

ہر کہ میخوابد کہ میز شکل فروزین گویا این قصر و این باغ عیالوں ابین
الغرض صنعت و حرفت اُس زمانہ کے لحاظ سے خاص بلاد اسلامیہ کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ بالخصوص اُنڈلس ان کاموں کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ تمام یورپ کی اسلامی ترقی اور اُسین رہنے والے صناعتوں کی صنعتوں کو دیکھ دیکھ کر رشک و حسد کی آگ میں جلا جاتا تھا۔ سپین میں ریشم کی صنعت کو بہت ترقی ہوئی چنانچہ عمدہ اور کثیر تعداد میں مختلف ریشمی اشیاء اور ریشمی پارچہ وہاں تیار کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ اعظم کے وقت میں صرف قرطبہ میں ایک لاکھ تیس ہزار ریشمی پارچہ باف آباد تھے۔ اسکے علاوہ ایک بڑی تعداد مینا کاری۔ چوہر نگاری۔ کوزہ گری اور ظروف سازی کے کام کرنے والوں کی تھی جو اپنے اپنے کاموں میں یدِ طولی رکھتے تھے اور جنکی ساختہ اشیاء آج تک صدیاں گزر جانے پر بھی عجائب خانوں کی رونق کو دوبا لاکر نیکے ساتھ ہی اسوقت کی صنعت و حرفت کا یقین ثبوت زمانہ کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

جیسبرونا کے مشہور گرجہ کے آلٹر دقربان گاہ پر خلیفہ حکم ثانی کی مرصع یادگار اب تک موجود ہے جو اُس زمانہ کے مینا کاروں اور چوہر نگاروں کی اس عظیم درجہ کی کاریگری ثابت کر رہی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا بس ہے جس میں چاروں طرف چاندی کا طمع کیا ہوا ہے اور جا بجا آب و آسمانی اور جواہرات نصیب

ہوئے ہیں اور پشت پر دل آویز عربی خط میں ایک عربی کاکیتہ تحریر ہے جس میں سلطان موصوفتہ حق میں دعائے خیر کی گئی ہے۔

شاہد ملین شاہ فرانس کو جو گھڑی خلیفہ یارون رشید نے تحفہ محض اپنے بیان کی صنعت و حیرت دکھانے کے لیے بھیجی تھی تاریخ منقذ ہے کہ اس کے دیکھنے سے وہاں کے لوگوں کو کس قدر حیرت و استعجاب ہوا تھا۔ یہ گھڑی عجب صناعت کی تیار کی گئی تھی ایک کے اندر سے ایک سوار اٹھتا تھا اور دو بچے دو۔ اسی طرح ۳۴ گھنٹوں میں چوبیس سوار تک تعداد پہنچ جاتی تھی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جبکہ بقول ایک انگریز مورخ اہالیان یورپ گھانس کے ناگ اور بستر اور خس پوش مکانات کو اپنا عالی شان محل اور نرم بستر تصور کرتے تھے۔ جب یہ گھڑی وہاں پہنچی ہے تو اس کی کما حقہ کیفیت جاننا تو درکنار وہ لوگ بغیر سکھائے ہوئے اس کے طریق استعمال کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے یا آج اسی ملک کے لوگ اپنی حیرت انگیز و عجیب خیر باد یارون سے دنیا بھر کو خبر کیے ہوئے ہیں مگر افسوس کہ اسی فلسفیانہ مذہب کے پیرو جسے تمام دنیا کو تمدن اور مذہب بنادیا آج عالم کی نگاہوں میں نیم وحشی جاہل اور غیر مذہب بن رہے ہیں نہ اپنی مذہب و فلسفے بیدار نہیں ہوتے اور سم تو یہ ہے کہ اگر ان کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو وہ اپنی اس حالت کا باعث تقدیر و زمانہ کو ٹھہرا کر اور بھونچ کر اپنی نادانی کا سارا بار رکھ کر بخیاں خود سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

زمانہ نے کو کسی کو ایک حال پر قائم نہیں رہنے دیا بلکہ دنیا میں ہر چیز کو زوال و کمال پیش آتا رہا ہے مگر صرف زمانہ کو ہر کام میں شریک کرنا اور اپنے منزل و ادباز کا باعث قرار دے لینا عقل سے بعید ہے اس لیے کہ زمانہ کو تنہا اسے فعال سے پورا لگاؤ ہے۔ تم جیسا کام کرو گے زمانہ کے ہاتھوں تم کو ویسی ہی جزایا سزا ملیگی۔ کیا مذہب کی بات ہے کہ اپنی بربادیوں اور تباہیوں کے باعث تو خود ہم ہی ہوں اور جیسے اپنے افعال کی پاداش بھگتیں تو زمانہ کو برا بھلا کہنے لگیں۔ اسی طرح تقدیر کو سمجھ لیجئے کہ پاؤں میں کھٹاڑی تو ہم خود ماریں اور جب زخم آئے تو لیکن تقدیر کو دھڑا دھڑا کر سنے۔ بھلا یہ کونسی دانشمندی ہے؟ اگر ہم اپنی حالت کو درست کر کے دنیا کی نگاہوں میں پھر وقوع و ممتاز بننا چاہتے ہیں تو ہمیں قرآنی

تعلیم کو شمع ہدایت بنانا اور اُسکے پاک ارشادات کو دستور العمل زندگی قرار دینا چاہیے۔ یقین تو اقل مرتبہ موجودہ مقتدر و سربرآوردہ اقوام کے طرز معاشرت - تہذیب - تمدن اور حسن اخلاق سے ہی سبق حاصل کرنا چاہیے۔

دیکھو! جمہوریت اہل عرب گنہگار اور جہالت کی زندگی بسر کر رہے تھے اُسوقت کیا اصول عقائد تھے اور جب تبلیغ اسلام سے ایک نئی روح بیونگی گئی تو انھوں نے کیا وتیرہ اختیار کیا؟ اول الذکر حالت میں نا انصافی - خانہ جنگی - اور طوائف الملوک کی ایک شاہین برپا تھی اور فسق و فجور اُنکے دل و دماغ میں ساری تھا۔ علم کی طرف سے بالکل بے پرواہی اور لوہے کے بے حد دلدادہ تھے مگر موخر الذکر حالت اُن کی کایا پلٹ

دی اور اب وہ سفاہت و جہالت کو خیر باد کہہ کر معصیت کاری کو چھوڑ کر - لیب پر لعنت بھیج کر اور گمراہی سے نکل کر پکے متحد اور خدا پرست بن گئے۔ اتحاد و یکدلی کو اپنی زندگی کا جزء اعظم بنالیا اور آخر کار یہی اخوت اسلامی اُن کی کامیابی و مقصد کار کا بڑا راز بن گئی۔ اسی کی برکت تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے اپنے طرز عمل

اور حسن اخلاق سے دنیا کو سحر کر لیا اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک بے بہا اور قابل تقلید نظیر بن گئے۔ کچھل کے مذہب و ترقی یافتہ اقوام کا جو طرز معاشرت اور جسکی چہرے دنیا کی نگاہوں میں یہ ممتاز اقوام شمار کی جاتی ہیں اگر آپ عمیق نظر سے دیکھیں تو آپ کو اُن میں بھی وہی اوصاف نظر آئیں گے جو کبھی مسلمانوں اور بالخصوص عربوں

میں تھے۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں سے وہ اوصاف حمیدہ مفقود ہوتے جاتے ہیں اور خود غرضی و انانیت کا مملک مادہ اُن میں بڑی شریعت کے ساتھ اپنا زہر ملا کر پھیلا جاتا ہے۔ بلکہ مجورنی کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے بلا درنج یہ کہدینا چاہیے کہ مسلمانوں سے نیک عادات اور نچستہ صفات بالکل جاتے رہے اور خود بینی و خود پرستی کی

زہریلی ہوائے اب انہیں جان بلب یا آفتاب لب بام بنا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں خدا اُن پر رحم کرے اور آئندہ اُن کو اپنی دینی و دنیاوی فلاح و بہبود میں گرم جوشی سے حصہ لینے کی توفیق رفیق بخشے۔ آمین!

میں نے یہ مختصر مضمون لکھ کر اپنے اسلاف کے تھوڑے سے کارنامے ہدایت نظر دیکھ کر اُن کے ہنر سے محض اس غرض سے کہ آپ اپنی اور اُن کی گذشتہ و موجودہ

حالتوں کا مقابلہ کر کے یہ معلوم کر سکیں کہ وہ کیا تھے اور ہم کیا ہیں ؟ اور آئندہ ہمیں کیا ہونا چاہیے ؟
اگلے مسلمان اگر دنیا میں پھر پیدا ہو جائیں تو کیا ہم کو وہ مسلمان کہتے ہوئے نہ سہمنا گئے ؟ ہمیں ضرور اور بالضرور انھیں غیرت آئے گی ۔ تدارست کے پسینے میں ہنا جائیں گے ۔ اور عرق افعال اُن کے غیور خیموں سے برابر ٹپک پڑے گا پھر کیا یہ شرم کا مقام نہیں ہے کہ وہ تو ہمارے افعال شنیعہ دیکھ کر نادم و شرمنا ہوں اور ہم گنہگار و خطاوار ہو کر بھی نہ شرمائیں اور اپنی ناشائستہ حرکات کے نتیجے کے باوصف ہمارے کانوں پر جون تک نہ رسیدے

سلا تو افسوس عبرت کی جا ہے	زنا نہ غم قوم میں مبتلا ہے
تھیں ڈھونڈتا در بدر وہ پھر	بڑی شکون سے نکا یا تہ ہے
بیت روچکے روئیو لے اٹھو	زنا نہ جو کتا ہے وہ ہی کروا ب
	راقم سید نظام الدین شاہ خیر آبادی -

اجڑی بستی ✓

قدرتی مناظر کے جیسے قدردان شعراے عرب ہوئے ہیں شعراے فارس سنیں ہوئے ہیں ۔ فارسی شاعری میں رزم و ترم - حسن و عشق - مدح و ہجو - بند و موعظت - تصوف و معرفت - سب چیزیں ملی گئی ہیں کہیں نہ نظر ملے گی کہ ایک جوان نصیب اپنے وطن کے اجڑے ہوئے کھنڈروں یا اپنی کسی اگلی خیمہ گاہ کے نشانوں پر کھڑا رہا ہے ۔ وہ ابن کھنڈروں ہی میں سے ڈھونڈھ کے ۔ اور گویا راکھ کو گرد گرد کرید کر عشق کی جنگا ریاں نکالتا ہے ۔ اور اپنی آہوں کی ہوا سے دھونک دھونک کر اُنھیں بھڑکاتا ۔ اور اپنے تن بدن ہی میں سننے والوں کے سینوں تک میں آگ لگا دیتا ہے ۔ تلاش کر کر کے اگلی رولق کے سنے نفوش کا پتہ لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ بیان محبت احباب گرم ہوتی تھی ۔ بیان حمان نوازی کی آگ روشن رہا کرتی تھی ۔ بیان قبلہ کی لڑکیاں دوڑتی دھو پتی مچلتی کودتی تھیں ۔ اور بیان

میر سی سہمی یا لیلے اپنے خیمہ سے نکل کے مشقِ ناز کیا کرتی تھی۔
 اگر غور سے دیکھیے اور عبرت کی نگاہ ہو۔ تو جتنے اُجرے کھنڈر اور جتنی
 سولی ستیانِ مضر و قاس اور ہندوستان میں ملین گی سرزمینِ عرب میں بنین مل سکتی ہیں
 مگر ہم نے ان پر جا کے نہ کبھی مالِ نیم شبی کا چراغ جلایا۔ اور نہ کبھی اُن کی پُرسوزِ بیا
 خا موش سے حسرت کی داستانِ سُن کے آنسو بہائے۔ یہ خلا ف اسکے عرب ایسا
 پُرسوز و گداز دل لے کے آئے ہیں کہ عمارتوں کے کھنڈر۔ اور مستیوں کے آثار
 بنین تو اُس اُجاڑ وادی ہی پر کھڑے ہو کے رو بہتے ہیں جہاں اُن کا یا اُن کی
 محبوبہ کا قبیلہ چند روز تک خیمہ زن رہا تھا۔ اُس پُراؤ کی یادگار میں سوا جا بجا
 راکھ کے ڈھیر کے جو ضیافتِ قوم اور بدوی مہمان نوازی کی نشانی ہے۔ اُن
 گڑبوں کے جہاں خیموں کی ٹھنڈی گڑی ہوئی ٹھنڈی۔ اُس داغِ بیل کے جو خیموں کی
 قطار کا ثبوت دیتی۔ اور اُن کے نصب ہوئے کی وضع بتا رہی ہے۔ کوئی چہرین
 باقی ہے۔ مگر جذباتِ دل۔ اور جوشِ عشقِ ظاہر کرنے کے واسطے اُن کے لیے
 یہی علامتیں کافی ہیں۔ اور انہیں دیکھ دیکھ کے خدا جانے کیا باتیں یاد آ جاتی ہیں۔
 سر و مہران وطن۔ گو تمہارا دل ویسا رقیق۔ اور تمہاری نظر ویسی عبرت
 بین بنین مگر چونکہ نوا دشتی جوش کا زمانہ ہے لہذا ہمارے ساتھ جیل کے تم پلنے
 دیس کی کسی سٹونی بستی کی تو سیر کرو۔ اور اُس کے مٹے آثار پر معاً خیال کی مدد سے
 اُن گری بڑی عمارتوں کو جسے سر سے قائم کر کے دیکھو کہ وہاں کبھی کیا تھا؟
 کیا ہو رہا تھا؟ کیسی رونق تھی؟ اور کس شان و شوکت کی چل پھل تھی؟ ہم متحین کسی
 پُرسے تاریخی اور مشہور و معروف شہر کے منہدم آثار پر نہ رہے جلیں گے۔ کیونکہ اُن
 کی گزشتہ اور پامال شدہ عظمت کے لیے ہمارے تمہارے سے چند آدمیوں کا۔
 رہنا کافی بنیں۔ اور صرف چند شخصوں کی حسرتوں کے چراغ اُن میں اتنی روشنی
 نہ کر سکیں گے کہ کچھ نظر آئے۔ اُن پر قوموں کو رو نہا جاوے۔ اور بڑے بڑے گروہ
 کھڑے ہو کے غم کریں تو شاید ان قومی ادبار کے عظیم الشان غزاخون میں اُن
 کی شان کے مناسب شور و شیون ہو سکے۔ ہم تو ایسی سنسان اور رنجونی بستی کے
 کھنڈہ و حوڈھنا چاہتے ہیں جس کا نام بھی اُس کی دیواروں کی ٹٹی کے ڈھیر

کے نیچے دیکے اس طرح غائب ہو گیا ہے کہ کسی طرح معلوم ہی نہیں ہو سکتا ہے جسکے محدود اور چھوٹے سے ریت البکا میں ایکلے ایک شخص کا رونا بھی کچھ شور پیدا کر سکے۔

بیرل آف سرجان مور

(یعنی سرجان مور کا فن)

سنہ ۱۱۰۰ھ میں سرجان مور ایک نامور برٹش سپہ سالار گلاسگو میں پیدا ہوا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں فوج میں داخل ہوا۔ ناموری کے ساتھ مالکامیر کوہ - اینڈ مصر - وغیرہ میں فوجی خدمات انجام دیے مگر اس کا سب سے زیادہ متم با نشان کارنایاں جیسرس کی شہرت کی بنیاد ہے۔ ایک سخت دشوار میدان جنگ میں ہوشیار سی کے ساتھ تھچے ہٹ آتا ہے۔ ہسپانیہ میں کمانڈر انچیف کرونا کی طرف اپنی ماری فوج یعنی چلے کے جارسے میں بڑھا چلا جاتا تھا۔ ایک طرف کو ہسار نکلا شیا اور پس پشت غنیم کی فوج کا ریل تھا۔ لڑائی ناگزیر تھی۔ انکو ہر سپاہ سانسے آنے والے غنیم پر ٹوٹ پڑی اور شکست فاش دی۔ مگر یہ فتح بہت ہی گران قیمت پر خریدی گئی تھی۔ اس لیے کہ سرجان مور کا ایک گولہ سے کام تمام ہو گیا۔

(۱۰۰۰ - جنوری سنہ ۱۱۰۰ھ) اس کی لاش کو جنگی وردی میں لپیٹ کر اس کے دستہ کے افسردان نے کرونا کی شہر سپاہ کے اندر دفن کر دیا اور بہت ہی عجلت کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ غنیم کے اتواپ کے خبروں نے تجنیر و کفین کا وقار بڑھایا۔ اور فریخ جنرل سولٹ نے متونی کی نجات کے لحاظ سے منایت ہی وقار اور جرئت کے ساتھ میدان جنگ میں بطور

یادگار ایک مینار قائم کر دیا۔

جب ہنازہ لیکے سر سے چلے سولے حصار
اُس لحد پر دفن جہیں تھا وطن کا جان نثار
اپنی سنگینوں سے اُس کی قبر بنے کھود لی
رو رہی تھی شمع اُس پر باہزار آنکھیں

طل کی آوازائی نے صدا تھی فوج کی
اوداعی توپ سراک بھی سپاہی نے نہ کی
نیم شب اُس کو کیسا مدفون با صد خاشی
ابری چادر میں منہ ڈھانپے ہوئے تھی چاندنی

اُس کے لاشہ کو قلعی کیا تاہو انکی حاجت بھلا
 مثل مرد کا رزا آرام سے لیٹا دھتا
 فاتحہ خوانی ہوئی بھی تو بہت ہی مختصر
 جم گئی تھی یاس کی مرید کی صورت پر نظر
 اک عجب بُرد رسیدا ہو گیا دلین خاں
 ہاے گل دشمن سے ہوئی اُس کی ترب پائال
 یاد کیا اُس کو کرین کے غیر سے دشمن بھلا
 ایک برطانی نے جس جادفن اُسکو کر دیا
 نصف یہ دشوار کام انجام پایا بھی نہ تھا
 دشمنوں کی توپ سے میدان سارا گلی بچا اٹھا
 قبر میں اُس کو لٹایا بادل سینہ نگار
 سنگ ترس نہ کچھ تحہ بر اُس کی یادگار

لا خطہ ہو
یہ اویس لکیر
کے تانہ قضا
ضرور ملگوائے
یوسف وحمہ
قام وکال عمر
ضیہ بغدادی
خواجہ
حسین زرین
پیشستی

پیر مرن سے کیا غرض تھی تھا کفن سے کام کیا
 بان لباس جنگ سے بیشک تھا جسم آراستہ
 اور نہ آپس میں کیا کچھ پہننے اظہارِ حال
 فکرِ فردا سے مگر دل کا بہت تھا بغیرِ حال
 تنگ بستر کھو کر جب خشتِ بایں کی بہت
 اور ہم دریا پہ ہون گئے دو غم سے بے حرکت
 بد کہین گئے کھایوں کا اُس پہ ہنہر برساتی گئے
 گر اُسی جا سونے دین تو دو غم ہو جائیں گے
 دی صدا ساعت سے واپس چلنے کی آئی گھڑی
 طرب سے تو پون کی اُنکے تھی نما یاں سننی
 لائے تھے میدان سے جسکو خونِ فشانِ نادر
 چھوڑ جاتے ہیں اُسے نہا ہے شہرت کی یار

بدر الزمان - از حکومت -

تاریخ کلکتہ

جس میں خوب لکھی کہ ساتھ قدیم الایام کے سنہری سائے کو غریب بھی مختصر اور سچ کیسے کہے ہیں۔ یہ ایک چھوٹی سی مصنفین کی کتاب ہے جس کو مولوی محمد بدایہ زمان صاحب نے جن کی نظموں سے ہمارے ناظرین کے کان نا آشنا نہیں نہایت قابلیت سے لکھ کر اسے ۱۸۔ ۲۲۔ پیمانے کے کاغذ پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ چھپوا کر شائع کیا ہے۔ ہم نے باوجود عدم افرصت کے اس رسالہ کو شوق سے دیکھا۔ اور سمجھتے ہیں کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ کلکتہ فی الحال ہندوستان کا دارالسلطنت ہے اور اپنے حالات میں اس سے زیادہ ضخیم کتاب چاہتا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ مولوی محمد بدایہ زمان صاحب کی محنت بیکار نہ جائے گی! اور ملک اس کی پوری قدر کرے گا۔ قیمت فی جلد ۱۲ روپے کتاب کی حیثیت کے دیکھتے ہیں زیادہ سینہ ۱۰ روپے اور دوسرے بھر کے قدر دانوں کو ضرور ملے گا انا چاہیے۔ مصنف کا پتہ کلکتہ۔ نمبر ۴ مولوی اسماعیل ٹیٹ۔

الحکم الرفاعیہ
۳۳
مینجہ و لکھنؤ

✓ نہ ہونے والی چیز کی ہوس

انسان! غافل و ناعاقبت اندیش انسان! تو اُس قدر بے وقوف کھن بچا
ہو سون نے تجھے دیوانہ کیوں بنا دیا؟ یہ کیا شامت ہے کہ نہ ہونے والی چیز کی تمنا
میں تو اُن برکتوں اور نعمتوں کو جو موجود ہیں اسطرح بھول جاتا ہے کہ گویا وہ ترسے کام ہی کی نہیں
گویا اُن سے تو نے کبھی لطف ہی نہیں اٹھایا۔ ایک موجد آرزو کے پندے میں کھنس کر
تو اس طرح غافل و از خود درفتہ ہو جاتا ہے کہ علی ہویٰ نصیحتیں اور قبضہ میں آئی ہوئی دولتیں
ترسے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں اور کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور پھر اُن کے پیچھے جانے کے بعد تو
بچھتا تا اور افسوس کرتا ہے مگر باوجود اسکے اتنا قبضہ نہیں ہوتا کہ اُن نعمتوں کی قدر کرے جو ابھی ترسے
ہاتھ میں تھیں۔

تو نے اُس کتے کی کمائی اکثر سنی ہوگی جو ایک روٹی کا ٹکڑا لیے ہوئے ندی سے
پار ہو نا چاہتا تھا۔ پانی میں اپنا عکس دیکھ کے سمجھا کہ یہ کوئی دوسرا کتا ہے اور اُس کے
پاس بھی روٹی ہے۔ اُس کی روٹی چھین لینے کی ہوس میں زور سے بھونکا۔ اور اُس کے منہ
کی روٹی بھی پانی میں گر سکے غائب ہو گئی۔ یہ کمائی تو نے اُن کتابوں میں اکثر بڑھی اور یاد کی ہوگی
جو کچھ بچپن میں پڑھائی جاتی ہیں۔ مگر اسطرح شاید تیرا خیال نہیں گیا کہ اصل میں وہ کتا تو ہی
ہے۔ اُس کتے نے تو اُس ہوس میں بڑکے صرف ایک روٹی کا ٹکڑا کھ لیا تھا مگر تو نے
خدا اچانے کیا کچھ کھو یا۔ اور افسوس آج تک تبتہ نہیں۔ بڑا تو طرز عمل ہی ہو گیا ہے کہ

ہمیشہ اس نعمت کی بے قدری کرتا ہے جو پاس ہے۔ اور اس دولت کی یاد میں بیٹھ کے رو تا ہے جو ہاتھ سے جا چکی۔

لوگو۔ نور سب چیزیں چھوڑ کے پہلے اپنی عمری کا خیال کرو۔ آغوشِ مادر کی سٹیکیاں ممکن نہیں کہ یاد نہوں۔ وہ زمانہ یاد ہے جب اپنی آرزو میں پوری کرنے والے تم نہ تھے بلکہ اور لوگ تھے۔ وہ تعمیرِ ہر طرح کی خوشیاں پوری کرنے کو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد خیال کرتے تھے۔ مگر تمہیں ہوشش نہ تھا اور خبر بھی نہ تھی کہ کس منزل کے عالم میں ہو۔ اندون خدا نے تمہیں جو فائزِ الہی عطا کی تھی پھر کبھی نہیں نصیب ہو سکتی۔ امارت کا سب سے بڑا نمونہ یہ ہے کہ تمہیں اپنے کام آپ نہ کرنا پڑیں بلکہ کوئی اور کر دیا کرے۔ اس غرض کے لیے تم فکر رکھتے ہو۔ لونڈی غلام فراہم کرتے ہو۔ عمدہ سوار یاں فسر اہم کرتے ہو۔ اچھے اچھے مکان بناتے ہو۔ اور نرم و نازک کچھو نے بچھا اتے ہو۔ اور پھر کبھی نہ پورا اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اور وہ فائزِ الہی حاصل ہوتی ہے جسے تم چاہتے ہو لیکن اس بچپن کے عہد میں خدا تمہارے لیے ایسا سامان فراہم کر تا ہے کہ کسی قسم کی حیرت و شگافی ہی نہیں پڑتی۔ مان باپ سے لونڈی غلام اور نوکر چاکر ہر وقت خدمت کو حاضر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ اور کسی غرض کے تمہارا ہر طرح کا کام کرنے کو موجود ہیں۔ تم ایسے عضو معطل ہو کہ کسی کام کے نہیں۔ گویا ہمارے امرا کی ناکارگی کی سچی تصویر ہو۔ کہ خدا نے نہ ہاتھ دیے ہیں نہ پاؤں۔ نہ زبان دی ہے نہ سمجھ۔ نہ اطمینان دی ہیں نہ کان۔ نہ چکھنے کا سلیقہ دیا ہے نہ سونچنے کا۔ اور خود پرست اتنے برے کہ کسی کی کچھ ہستی ہی نہیں سمجھتے۔ لیکن ان تمام دشواریوں کے دور کرنے کے لیے خدا نے ایسے پالنے اور خدمت کرنے والے دیے ہیں کہ انہیں کی آنکھوں سے تم دیکھتے ہو۔ انہیں کے کانوں سے سنتے ہو۔ انہیں کی زبان سے چکھتے اور انہیں کی ناک سے سونچتے ہو۔ انہیں کے پاؤں سے چلتے ہو۔ انہیں کے ہاتھوں سے کام کرتے ہو۔ بیان تک کہ انہیں کے منہ سے بولتے اور انہیں کے دماغ سے سمجھتے ہو۔ اس درجہ کی خود فراموشی اور امیرانہ بے دست و پائی کسی بڑے سے بڑے مالدار اور کامل سے کامل دولت مند کو بھی نہ نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن انکس اپنی اس فائزِ الہی اس بیگاری اور اپنی اس مصوٰدِ باطنی کی تم نے قدر نہ کی۔ مگر اس وقت اپنی فطرتِ ناگہمی کے باعث تم معذور بھی تھے۔ تم

سمجھ ہی سکتے تھے کہ خدا نے تھیں کیسی سلطنت اور کتنی بڑی دولت عطا کر رکھی ہے۔ کیونکہ اگر ذرا بھی کچھ ہوتی تو ان نعمتوں کی تم چاہے قدر نہ کرتے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ اس سے پیشتر کے عالم بجز محض صبح ازل کے آغوش - اور ہر کو وحدت کے دامن میں چھپے ہونے کی باہرہ کیفیتوں کی یا تھیں عین اور تمھاری ان بیفکریوں کو بے مزہ نہ کر دیتی۔ عام دنیا والوں کی طرح تمھاری یہ حالت ضرور ہوتی کہ اس عہد کی موجودہ نعمتوں کی قدر تو نہ کرتے لیکن اس سے پیشتر کی چھٹی ہوئی دولت سرمدی کے صد مومن سے بے قرار ہو کر روتے ضرور۔

لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ جوانی آئی - ذمہ داریوں کا بار سر پر رکھ دیا گیا۔ اور شباب کا باغ جو دور سے تھیں فرحت بخش تر و تازہ اور ہر اہل نظر آتا تھا سامنے ہو گیا۔ اب بغیر اس کے کہ اس زمانے کی برکتوں اور مسرتوں کی طرف تمھارا خیال رجوع ہو۔ موجودہ حالت سے غافل و بے پروا ہو کے تم زار و قطار روئے اور سر دھتے لگے۔ یہ غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جو جو ہوش آتا تھا۔ بچپن کے لطف اور زیادہ مزہ دار معلوم ہوتے تھے شباب کے باغ میں بھولوں اور دلچسپی کے سلاخوں پر نظر نہ پڑتی تھی اور ہر طرف کانٹے ہی کانٹے دکھائی دیتے تھے جو دامن میں اسی طرح اٹھتے کہ اگر ادھر پیٹے تو ادھر کا دامن ٹپا جاتا ہے۔ ادھر بڑھے تو ادھر کا دامن نکلا جاتا ہے۔ یہ پریشانیان بچپن کی فارغ البالی کو اور یاد دلاتی ہیں اور ہر وقت مرثیہ خوانی میں مشغول رکھتیں۔

انہیں غفلتوں میں تھے کہ تو سن عمر جوانی کے بڑھنا باغ میں سے ہی نکال لے گیا۔ اور اب نظر آیا کہ جوانی خدا کی بڑی بھاری نعمت و دولت تھی لیکن ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ اس وقت کے دلوں میں عہد کے حوصلے - اس زمانے کی قوت و طاقت اور اس دور کی صحت و طمانیت ایسی چیزیں تھیں کہ جو جابستے کر لیتے مگر انہیں کس کہ کچھ نہ گیا۔ اب بھی خدا نے بزرگی و اعتبار - تجربہ کاری و پختہ مغزی کی ایسی بہت سی خوبیاں اور اعلیٰ درجہ کی پرکھتیں ہی تھیں لیکن جوانی کی یاد اور شباب گمشدہ کے غم میں ان سے فائدہ اٹھانے کی حمت ہی نہ ملی۔ خلاصہ یہ کہ مر گئے۔ اور مرنے دم تک ہی عالم تنہا پہ نہ ہونے والی چیز کا غم - اور بے حوصلگی کی خوبیاں کی بے قدری۔

تم نے بڑی بڑی زبردست قوموں اور اگوا اعظم فرما دیں اور ان کی عالی شان طاقتوں کی تائید پڑھی ہوگی۔ یہ دھوکا ہے کہ انھیں فلاں قوم نے پامال کیا۔ یا فلاں بادشاہ نے تباہ کر دیا۔ جو سرگزشت اپنی عمر کی سن چٹکے ہو وہی ان کی بھی تہہ لو کہ موجودہ عروج و ثروت کی قدر نہ کی۔ دور کی ہوسوں کی دھن میں موجودہ ترقی و مقصد دہری کو کھو دیا۔ انسان غور کرے تو آپ کو ایک مہووم نقطہ پر پائے گا جسے زمانہ حال کہتے ہیں یہ بہت ہی بے اعتبار اور ناپائدار نقطہ ہے۔ اور اس طرح آتے ہی غائب ہو جاتا ہے کہ اچھی طرح اسکی حالت اور موجودگی کا انداز بھی نہیں ہونے پاتا۔ ایک نسیم کا جھونکا ہے کہ آیا اور چلا گیا۔ یا زمین ہے کہ یکا یک پڑاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ جس زمانہ میں کہ قیام و استقلال کے کچھ آثار نظر آتے ہیں وہ اگر مشہدہ اور آئندہ زمانے ہیں۔ گزشتہ زمانہ اگرچہ نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا جا رہا ہے مگر نظر ایسا آتا ہے کہ ہم سے دور جا کے کھڑا ہو گیا۔ اور آنے والا زمانہ گو بڑی سبک روی کے ساتھ دوڑتا چلا آتا ہے مگر شوق دامن انتظار کو پھیلاتا۔ اور دہائی امتداد کو بڑھاتا ہے۔ انسان کا قدم اگرچہ حال کے نقطہ پر ہے مگر وہ کبھی گھبرا کے گزرتے رہتا کی طرف دیکھتا ہے جو اس کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے دور جا کھڑا ہوا ہے۔ اور کسی مشہدہ اور وضدی لڑکے کی طرح اس کا منہ چڑھا رہا ہے۔ اور کبھی ذوق و شوق سے دوسری طرف یعنی آنے والے زمانے کو دیکھتا ہے۔ اور کسی وعدہ فردا کے امیدوار کی طرح اکتا اکتا کرتا ہے کہ دیکھیے یہ دھپیان جو آنے والے زمانہ کے آغوش میں نظر آ رہی ہیں بہین زندگی میں نصیب بھی ہوتی ہیں یا نہیں۔ غرض زمانہ حال کی وسعت بہت ہی تنگ بلکہ محدود ہے۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ ہم موجودہ گھڑی کو اسوقت اپنے قبضہ میں باور کرتے ہیں جب وہ جا چکتی ہے۔ اس کے چلے جانے کے غم و غصہ میں مشغول ہوتے ہیں کہ دوسری گھڑی جو اس پہلی کے بعد آتی تھی وہ بھی نکل جاتی ہے اور ہم حیرت سے دیکھ کے شذر و بہوت ہو جاتے ہیں۔

اور سب نعمتوں کی طرف تو ہمارا خیال بھی کبھی نہیں متوجہ ہوتا لیکن ہمارا دلست وصل ایک ایسی چیز ہے جس کے بظاہر ہم بڑے قدردان ہیں۔ کیونکہ ہمارے شاعری اس کے ذوق و شوق سے بھری پڑی ہے۔ اور ہمارا تمام لٹریچر گویا وصل اور ہجر کا جاناں کے قصائد کا دفتر ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس محل کی بھی ہم نے کبھی قدر نہیں کی۔

کیونکہ جس کی گھڑی اُسی ناپائیدار گھڑی کا نام ہے جسے زمانہ موجودہ کہتے ہیں۔ اسن کے ایک طرف یعنی اُس سے پہلے تناؤ آرزو کی گرم بازاری ہے۔ اور دوسری طرف یعنی اس کے بعد ہجر و فراق کی آتش آفتابی۔ درمیانی حصین وصال کی ہے حقیقت ساعت یا تو صرف ایک موبوم چیز ہے اور یا ہے مگر اس قدر ناپائیدار کہ خبر ہونے سے پہلے ہی دامن چھڑا کے چلی جاتی ہے۔

اسے یعقل انسان اتیری اس قسم کی بے قصوریوں کی اس سے زیادہ محسوس تصویر کیا ہو سکتی ہے کہ وہ عورت دیکھو داغ دے جانے والے بچہ کو یاد کر کے نالہ و فریاد کر رہی ہے اور اُس بیٹے جاگتے تخت جگر کا خیال بھی نہیں کرتی جو پہلو سے لگا ہوا ہے۔ اگر اس کے موجود ہونے اور خدا کی اس مہربانی کی قدر کرتی تو وہ غم بالکل بھول جاتا لیکن کرے کیا یہ انسان فطرت ہے کہ نہ ہونے والے کی تمنا اور ہونے والے کی نفرتی

۷ ایک دلکش سین

ایوان شرق سے صبح کا نور پھیلنا چلا آتا ہے جس قدر رات کی سیاہ چاندنی سمٹتی جاتی ہے اُس قدر رُخ عالم پر نورانیت کا پوڑ پھیرنا چلا آتا ہے۔ اس سہانے وقت میں پھر نے کچھ اس بلا کے جذبات رکھ دیے ہیں کہ پیر نو سالہ کے مرجھائے ہوئے ولین بھی عالم شباب کی سی انگلیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور سیاہستان جام شباب کا تو کچھ کھنسا ہی نہیں خصوصاً وہ نوجوان بچے دل کسی تیغ ابرو کا چیر کا کھائے ہوئے ہیں نسیم سحر کی نازک نازک سانسیں ہر دم دلون کی روح تازہ کرنے میں دم عیسیٰ سے بھی دو ہاتھ اُٹھتی ہیں۔ اس سہانے اور پُر فضا وقت کی نیچرل کیفیت یوں تو ہر جگہ اور ہر مقام پر دل کو بھی معلوم ہوتی ہے مگر کسی سرسبز اور پُر فضا باغ و صحرا سے لالہ زار میں تو جوٹ کھائے ہوئے دلون پر بجلی ہی گرا رہی ہے۔ روشون پر نسیم سحر کی کاٹھنچاے ناشگفتہ کے ساتھ شکلیں گرنا اور ان کے نازک نازک کانوں میں کچھ کچھ چپکے چپکے کہنا اور ان ناخوشہ کار افسردہ دل کا خدا جانے کیا سمجھ مسکرا دینا اور پھر اس کا گدگدانا اور اچھا مضمون لگانا۔ اور سب اُسے آتے دیکھ کر تلی تلی شاخون کا ایک دوسرے کی طرف جھک

جھک کے کچھ کنہ غنچہ کا سرکار۔ گل نوشگفتہ کا گلکھلا ناسنان تو انسان حیوانات کو بھی
 متوالا اور خود رفتہ بنا دیتا ہے جنگل میں کوسوں تک بنرہ نویدہ ابلہا رہا ہے جسکے
 درمیان میں ہو کر بننے والی شفاف نہر بن خدا جانے کہاں تک سر جھکانے جاتی ہیں کہ جہاں
 تک نگاہ کام کرتی ہے عالم آب نظر آتا ہے۔ نباتات پر اس بلا کا جو بن ہے کہ ذرا
 دیر کو بھی نظر ہٹا نہیں چاہتی گلکھلا سے الہ بنرہ بنوٹوں کی آڑ سے ایسا دلکش چہرہ دکھا
 کر دونوں کے ساتھ مقناطیس کا کام کرتے ہیں۔ آفتاب کی نازک نازک سنہری شعاعوں
 نے شبنم آلود بنرہ اور سطح آب پر پنا دل لہجانے والا عکس ڈال کر ایک دوسری دھڑب
 سین تیار کر رہا ہے۔ سطح میدان میں ان شعاعوں کی زردی آمیز سرخی نے ہنسی زلف
 دراز میں پڑے ہوئے زری کے موبات کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لب جو پر سر نو غاستہ کا
 اکڑنا کسی قیامت قیامت نالی یادوں میں تازہ کر کے خود دہا رہا ہے۔ نیچل تسبیح خوان نے
 مرغان بھری سپے باغیان چمنستان عالم کی حمد و ثنائیں چھپے کرتے ہوئے اس شلخ سے اس
 شلخ پر اور اس سے اس پر اور ادھر ادھر پھرتے پھرتے ہیں۔ طلوع ہونے والے آفتاب
 کی سرخ سرخ کرنوں نے ڈرہائے شبنم کو لعل خوشاب بنا رکھا ہے۔ ہر سریر آب شبنم
 سے باد صوبو کو یاد خالق میں محو ہے۔ عنادل بیدل لگون کے گرد قربان ہو کر شرب
 فراق کی مصیبت سنا ہے ہن مگر ان خونیں رخ شاد لوں نے اس ہلاکی چپ سادھی ہے کہ
 مند جائیں چشم عاشق تب بھی وہ لب نہ کھولیں + پریل کر رکھا ہے۔ شمال کی جانب سے
 اٹھنے والی کالی گھٹانے اس دھڑب سین پر سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا ہے۔ باد بہاری
 کے ہلکے ہلکے جھونکے آزد ہائے مردہ کے ساتھ فصیح صور کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ کول کی
 کوک۔ مور کا شور۔ بیل کے جھجے۔ پیپہ کی پکار۔ مری کی کوکو۔ اور ہائے آتشا کا بلندی
 سے گر کر بنرہ خٹان دامن کوہ کے پاؤں پڑنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو بچپن اور بچپن
 دونوں کے ساتھ وہ سنو کہوتی ہیں جو ایک سو دیوانہ کے ساتھ کرے۔ ایک دلکش
 اور سہانے وقت میں ہم سیر کرتے ہوئے ایک پرفضا باغ میں ہو چکے ہیں جسکو دیکھتے
 سنے ہوئے یلغ جہان کا نقشہ آنکھوں میں کھجلیا ہے۔ اس باغ کے ہر ایک پتی اور ہر
 ایک برگ گیاہ پر اس غضب کا جو بن برس رہا ہے کہ زبان سے بے اختیار نکلتا ہے
 ہے اگر فردوس بر دے زمین است بھیست وہیں است وہیں است وہیں است وہیں است

ہر ہر شکاری ہی بجائے خود ایک ختن ہو رہی ہے۔ مرغان خوش الحان یا دھجکا ہی سے
جھوٹے واسے درختوں پر کچھ کس پر در دلچہ بین فتنہ سرائی کر رہے ہیں کہ دل ہاتھ سے
بکلا جاتا ہے۔ طارم تاک میں خوشہ ہائے انکور آویزان ہیں یا می سلیں کے بھرے ہوئے
آفتے ہیں کہ جنکو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھرتا ہے۔

راقم۔ محلانی خان منشی فضل برٹین
ٹیڈنڈل اسکول رام پور اسٹیٹ

شکران آل عثمان

علائق کو کبھی کسی اس بات کی بھی اجازت مل جاتی ہے کہ محلہ پیرایا بازار میں
جا کے کچھ خریدیں۔ یا کسی عام قہرچ کا ایک گاڑی پر بیٹھ کے سفر کریں۔ یا زمینوں کے
سوکھ میں اطراف و جوانب کے کسی سناوہ مقام میں جا کے کھائیں پھین بکک کا لطف
اٹھائیں کسی کھفہ یاد دوسری محافظت کے زیر نگرانی جو عورتیں کہ علاقہ میں داخل ہیں گاڑی
پر سوار ہو کے ایوان شاہی کے چائیکون کے اندر ہی اندر چکر لگاتی ہیں۔ لیکن اس
شان سے کہ گاڑی کے دونوں جانب ایک مٹا جی رہا کرتا ہے جو ایک ہاتھ گاڑی کے
دروازے پر رکھے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ اور اس کو ہدایت کر دی جاتی ہے کہ ایک منظم
کے لیے بھی گاڑی کا ساتھ نہ چھوڑے۔ لیکن یہ نگرانی بہ ظاہر اسباب محض ایک
ضابطہ کی پابندی ہے۔ اور فوجان عورتیں اس سیر سے بہت کچھ لطف اٹھالیتی ہیں۔
بعض اوقات جب حرم کی کسی خاتون کو ناسازی طبع کی شکایت ہوتی ہے تو حکیم صاحب
جن سے حرم وایون کا علاج متعلق ہوتا ہے تبدیل آب و ہوا تجویز کرتے ہیں۔ اس
غرض کے لیے یا تو مریفہ دو ایک ہفتہ کے واسطے کسی سلطانی نہایت گاہ میں بھیجا جاتا ہے جو دریا
باسفرس کے کنارے واقع ہے۔ یا کسی ایسی حرم والی کے ٹھہرنے بھیج دی جاتی ہے جو حرم
مٹا جی کے نفی منی لڑا رہے کے ہیں یہاں تو لیا کے مسلمان کسان ہیں جو حرم میں
لوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کا فرض منصبی یہ ہوتا ہے کہ باورچی خانوں اور آتش افون
کے لیے ایندھن فراہم کیا کریں۔ اور ہر دائرے کے خواجہ سرا کے ماتحت ہوتے ہیں۔

سے باہر کسی شخص کو بیاہ دی گئی ہو۔ اور وہاں حرم کے قواعد و آداب سے آزاد ہو سکے جن روز کے لیے ایک سادی آزادانہ زندگی کا لطف اٹھالیتی ہے۔ عورتوں کی ایک بستی بڑی جماعت میں جن میں ایک دوسرے سے کوئی خاندانی علاقہ نہ ہو انتظام قائم رکھنے کے لیے سخت قسم کے آداب و توہین جاری کیے گئے ہیں۔ اور بلحاظ مرتبہ اور عزت کے کم و بیش سخت سزائیں مقرر ہیں۔ اور بزرگوں کو ہر جگہ آداب حرم کی رو سے اس بات کی ممانعت ہے کہ کوئی عورت والدہ سلطانہ کی حضور میں اوپر کالبا سہن کے جائے۔ اسی قاعدہ کی رو سے علاقہ اور کلفہ و وفون کو ممانعت ہے کہ جب محل کے اندر کام کاج میں مشغول ہوں ایک ہلکے ڈوپٹہ سے زیادہ سنگین و گرم پردے میں اپنے شانوں کو چھپائیں۔ یہ ایک ایسا شایانہ قانون ہے جو مرض سل کے پیدا ہو جانے کا بھی سبب ہو جاتا ہے جو مرض کہ حرم سر امین اکثر ہو جاتا کرنا ہے۔ کلفہ جن کو انتظام سے تعلق ہے باضابطگی قائم رکھنے کے لیے کافی بین ہیں اس لیے کہ حرم میں زیادہ تر وہی عورتیں ہیں جن کا ابھی عنوان شایانہ ہے۔ تاہم بطرح بنے انتظام قائم رکھنا ضروری ہے۔ لہذا اگر حکمران مذکورہ کی سرگرمیوں میں سے کسی کی ممانعت میں کوئی تربیت پانے والی لڑکی اگر اپنے فرائض میں غفلت کرے تو وہ سزا کے ذریعہ سے درست کی جاتی ہے۔ پہلے جرم کے موقع پر ٹھپسی سے روکا جاتا یا سب سے الگ نظر بند کیا جاتا کہ کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ عورت اس سزا پر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئی تو وہ خواجہ سراؤں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ لگے دنوں خواجہ سرا یہ سزا دیتے تھے کہ باؤں کی ریٹریوں میں ڈنڈے مارتے لیکن اس سے چونکہ بعض لڑکیاں نکل دی ہو گئیں لہذا اب کسی جرم لکڑی سے پیٹی جاتی ہیں اور یہ بھی قید ہے کہ پانوں کے سوا کسی اور جگہ ضرب لگائی جائے۔

وہ لونڈیاں جن کا کام باورچی خانہ حمام اور دوسرے ذیل کاموں سے متعلق ہے اگرچہ محل میں ان کے لیے ترقی کے موقع بہت تھوڑے ہیں مگر اچھی طرح کھلائی چلائی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ سلوک بھی اچھا کیا جاتا ہے۔ اور ایک مدت تک کام کرنے کے بعد وہ آزاد کر دی جاتی ہیں اور اس وقت انھیں بطریق انعام ایک معتد بہ رقم دی جاتی ہے۔

اگر محل کی کوئی چھوٹی جوباب ہر یا ہی ہو لا وارث مر جائے تو اس کی تمام ذاتی جائیداد

اس کلفہ کو ملتی ہے جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ جس لوندی غلام کی خرید و بیکل کے لیے ہوئی ہو اور محل کے اندر ہی وہ مرجائے اس کی جائداد کے اصلی وارث خود سلطان ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خزانہ محامہ کی جو بھاری رقم حرم کی ضرورتوں میں صرف ہوا کرتی ہے وہ لوندیوں کے مرنے پر پھر خزانہ سرکاری میں داخل ہو جاتی ہے۔

خانگی غلامی جو ملک عثمانیہ کے مسلمانین مروج ہے اس غلامی سے بالکل متعارف ہے جو چند ہی روز ہوئے امریکہ کے سیجیون میں مروج تھی۔ ملک عثمانیہ میں بہت سے دھولی کے قوانین غلاموں کی حمایت کرتے ہیں مجموعی طور پر یہ کہ ان کے ساتھ مالک مان پاپ کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اور چونکہ اپنے سے جدا طبقہ کے نہیں خیال کیے جاتے اس لیے بہت ہی جلد آزاد و خود مختار اہل ملک میں مل جاتے ہیں۔ سوسائٹی کے موجودہ نظام کے مطابق محل کی خدمت کے لیے لوندی غلام لادتی ہیں۔ از روئے شرع غلام مسلمان آزاد و شریف عورتوں کے لیے بے وقعت و نقاب باہر نکلتا ناجائز ہے لیکن لوندی جو اپنے مالک کی جائداد ہے اس کے لیے لوگوں کے سامنے آنے کی چند ان ممانعت نہیں۔ حرم سلطانی میں حبشین اور دیگر عورتیں جو خط و خال اور حسن و جمال کے لحاظ سے نیک ملکہ جسمانی قوت اور قوی ہاتھ پاؤں کے اعتبار سے دوسری عورتوں پر ترجیح رکھتی ہیں گھر کے ذیل تر خدمات بجالانے کے لیے مول لی جاتی ہیں۔ گروہ حبشین خدا نے حسن و جمال اور اپنے خصلت و خال عطا کیے ہیں نازک قسم کے اسلاف فرض سرانجام دینے کے واسطے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

جیسے کہ عام بردہ فروشی کا بازار بند کیا گیا۔ چھٹی اور اندرونی بردہ فروشی دنیا عام ہو گئی۔ اور یہ نسبت اگلے زمانہ کے زیادہ پھیل گئی ہے۔ بیچ و خرید زیادہ وسعت کے ساتھ معزز طبقہ کی خاتونوں کے ہاتھ میں ہے۔ حبشین سے بعض خود بھی آزاد شدہ لوندیاں ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس سے وہ بہت منہ بہ نفع اٹھاتی ہیں۔ غلامانہ خصوص جبکہ ان کا کام و بار بڑے پیاسے پر جاری ہو جاتا ہے۔ جیسے ہی لوندیوں کی کوئی نئی کیسپ ادارہ میں پہنچتی ہے ایک دلال بردہ فروشی کرنے والی خاتونوں کے پاس بھیجا جاتا ہے۔ انہیں اگر ضرورت ہوئی تو یا گاڑی پر سوار ہو کے خود ہی پیشہ و بردہ فروشی کے گھر میں چلی جاتی ہیں۔ یا کہلا جیتی ہیں کہ لوندیاں معائنہ کے لیے ان کے گھر میں بھیج دی

جائین۔ یہ رود فرہش قانونین چہ سال سے دس سال تک کی عمر کی لڑکیوں کی بہت تنہائی رہتی ہیں۔ اُن کی قیمت وہ گھنوں کے قریب دیتی ہیں۔ اور امید یہ رہتی ہے کہ جب یہ سترہ برس کی عمر کو پہنچیں گی اس کی دس گونی رقم وصول ہو جائے گی۔ انتخاب اور معاہدہ بیچ کی گیل کے بعد لڑکی اپنے گھر میں لاکے ایک کلفہ کی زیر تربیت دے دی جاتی ہے جو نہایت سستی سے اُس حیثیت کے مطابق اُسے تعلیم دیتی ہے جس حیثیت کی اُسے زندگی بسر کرنا ہوگی۔ حیثیت یہ ہے کہ یا تو وہ کسی معزز شخص کی حرم یا بی بی بن کے رہے گی یا سلطان المعظم کے لیے مولیٰ یا باخداہلی مالکہ اُسے سلطان کی نذر کر دینی یا کوئی اور شخص اُسے خرید کے سلطان کو نذر کر دے گا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی وہ غرضیں حاصل کرے جو محل سلطانی سے وابستہ ہوں۔ اُن غیر مشیہ ورونڈیان بیچنے والیوں میں سے اکثر وزرا اور عمدہ داران سلطنت کی بیبیاں ہیں جن میں باہم لاک ڈالت رہا کرتی ہے کہ کس کے گھر میں زیادہ حسین اور زیادہ قیمتی کپڑے پہنے اور بنی سنوری لڑکیاں ہیں۔

جن لوندیوں کو کوئی معزز خاتون اس طریقہ سے اور اس غرض کے لیے مول لیتی ہے انہیں بانشلی اور دف بجانا۔ گاٹا۔ ناچنا۔ اور کاڑھنا سکھا یا جاتا ہے۔ ایک دینی محلہ یعنی خوجہ قانون اور اُس کی اتالیقہ اُسے عقائد اسلامیہ کی بھی تعلیم دیتی ہے اور نیز اُسے ترک کی محلات کے آداب و اخلاق اور اوضاع و اطوار سکھائے جاتے ہیں۔ حرم سلطانی میں قہوجی (قبوہ پلانے والی) اور شوبکچی (دشطب پلانے والی) کے آسان خدمات بھی اُن کی ہم پایہ لوندیوں کو سکھائے جاتے ہیں۔ بجز بڑی لڑکی اور بڑا لڑکا کی خاتونان ترک کے اور سب خاتونوں میں شطب کی جگہ سگرٹ کا رویج ہو گیا ہے۔ اور جھٹھی کے کمرے جو پچاس ساٹھ برس پہلے تمام معزز امراء کے ترک کی محل سراؤں میں ایک ممتاز جگہ ہوا کرتے تھے اب گھٹنے گھٹنے اودنے درجہ کے رہ گئے ہیں۔ یہ محلہ جس وضع و اسلوب سے خاتون مصر یعنی لہمی سلطانہ مذکورہ کی منہ بولی مان کے محل میں تھا اُس کا معقر تذکرہ اس موقع پر بے محل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس سے اُن کے گھر کی تصویر نظر آ جائے گی۔

شطب پلانے والی کے ذمے یہ خدمتیں ہیں کہ لمبی نے کو صاف اور تیار رکھے تھا کہ اور اُس کے لازم کو تیار کرے۔ اور جب بحر کے تیار کرے تو بنبی بی بی اور

ایک ہی مہمان خاتون کے سامنے پیش کرے۔ گو یہ سب کام بظاہر بہت آسان اور غیر اہم نظر آتے ہیں لیکن ان کے ٹھیک طور پر عمل میں لانے میں جیسی حد درجے کی احتیاطیں کیجاتی ہیں ان کے لیے بہت سے وقت اور چند سال تک سلکھائے جانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ خاتم افندیوں کو جو ادنیٰ ادنیٰ بات پر نام رکھتی ہیں نکتہ چینی کا موقع نہ ملے۔ شطب کا ہر حصہ شاہ بلوط کی خرا دی ہوئی لمبی نے کمر باکی مرصع منہال - اور مٹی کے شطب ضرور ہے کہ بڑی احتیاط سے اور جدا جدا صاف کیے جائیں۔ یہی حتیٰ یعنی علاقہ لو تاقیہ کا تبا کو ضرور ہے کہ باریک باریک کاٹ کے نرم لیمہ کا سا بنایا جائے۔ اور پھر شطب ضرور ہے کہ بہت ہی نفاست سے بھرا جائے مگر تمبا کو کم ہوا یا زیادہ بھر دیا گیا تو شطب پینے والوں کی نظر میں سخت پھوٹتا ہے۔

جب خاتم اور ان کے مہمان کھانے کے کمرے سے نکل کے دیوان خانے (یعنی ڈرائنگ روم) میں آئیں اور دنگلون پٹھین تو وہ کلفہ حاضر ہوتی ہے جس کا کام کافی پلانا ہے اور قہوہ جی "کھلاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کشتی ہوتی ہے اس پر ایک ازخوانی رنگ کی کارچوبی پوشش پڑی ہوتی ہے۔ چاندان - نیمھی نیمھی اسلے درجہ کی چینی کی پیالیاں اور سونے چاندی کے دیگر ظروف ہوتے ہیں۔ اس کافی پلانے والی ساقیہ کے پیچھے پیچھے اس کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے اور اس سے تعلیم پانے والی چوکریاں ہوتی ہیں۔ جو ایک ایک کر کے آگے بڑھتی۔ پیالی میں کافی اندلیتی۔ اسے تشری میں رکھتی اور بڑے ادب سے مہانوں کے آگے ان کے مرتبہ اور عزت کے مطابق ترتیب سے پیش کرتی ہے۔ یہ اس کا فرض ہے کہ ان مہانوں کے مرتبوں کو پہلے سے دریافت کر رکھے۔ تاکہ وقت پر کسی کم رتبہ والی کو پہلے کافی نہ دیدے۔ اگر ایک ہی مرتبہ کی دونین خاتونیں موجود ہوں تو ضرور ہے کہ نشست کی ترتیب کے مطابق انھیں کافی دی جائے۔ لیکن اگر مہمان خاتونوں سے خود گھر کی بی بی زیادہ رتبہ رکھتی ہو تو لازم ہے کہ کافی کی پیالی پہلے اسی کے سامنے پیش کی جائے۔

اس کے بعد سگریٹ یا حقون کی باری آتی ہے۔ سگریٹ ہر خاتون کے سامنے جدا جدا تھا لیون میں رکھ کے پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جب وہ خاتون سگریٹ کو اٹھا کے کمر بانی منہال میں لگاتی ہے تو ایک دوسری لونڈی ایک چھوٹے برنجی ظرف

کو ہاتھ میں لیے جس میں ایک روشن چنگا سی رکھی ہوئی ہے ادب آگے بڑھتی ہے اور خاتون اس سے اپنا سرگیت روشن کرتی ہے۔ مگر حقہ پیش کرنے کے انداز میں زیادہ مختلف وادب برتا جاتا ہے۔ حقہ پلانے والی لونڈی اس کے درمیانی حصہ کو ایک نزاکت کی اداس ہاتھ میں لیے ہوئے اور اس کی منال اتنی بلند کیے ہوئے کہ صرع منال خاتون کے خاص منہ کے مجاذی جو عجب خوش خرامی کی چال سے آگے بڑھتی۔ اور اس کے ہونٹوں کے قریب لیجا کے آہستہ آہستہ حرکت دیتی ہے اب وہ خاتون حقہ کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ اور لونڈی ایک تھالی کو جو اس کے دوسرے ہاتھ میں ہوتی ہے زمین پر رکھ کر حقہ کو بڑی نزاکت سے اس میں رکھ دیتی ہے اور آہستہ سے جھک کے اور سلام کر کے دور جا کھڑی ہوتی ہے۔ اب جبکہ خاتون کے ہاتھ میں حقہ کی نے ہوتی ہے ایک دوسری لونڈی ایک مٹی کی ظرف میں کو لے لیے ہوئے آگے بڑھتی۔ اور ایک خوبصورت تھے سے دست پناہ سے پہچم میں کو لے رکھتی ہے۔ اور ساتھ ہی خوشبو دھونین بکھرہ مکھن اٹھاتا ہے۔

جب سب حقہ روشن ہو چکے ہیں تو یہ خدمت گزار لونڈیاں کمرے کے بائیں میں صف باندھ کے دست بستہ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی آنکھیں خوبصورتی کے ساتھ نیچے کو جھکی ہوتی ہیں۔ اور تا وقتیکہ کسی کام کو بتایا یا انھیں بڑھانے کے لیے پھر نہ بلایا جائیں نہ نظر اٹھاتی ہیں اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کرتی ہیں۔ اس اثنا میں وہ چپکے چپکے دل ہی دلیں بیسیوں کے لباس۔ ان کی گفتگو اور ان کے اوصاف و اطوار پر خیال آرائی کرتی رہتی ہیں۔ ادھر بیسیوں میں آسمان شن کے اس عقد ثریا لونڈیوں کی صف پر بکثرت ہوتی ہے۔ اور نکتہ چینی کی شان سے ان کی نسبت رائیں قائم کی جاتی ہیں۔ اور ان لڑکیوں کے متعلق اپنی شخصی رائے کو وہ یوں آمیزش کی طرح سناتی ہیں کہ دیگر مقامات کے لوگ سن بائیں تو متحیر ہو جائیں اور ان کی بڑی دلچسپی ہو۔ انہیں سے بعض خافین ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں ان کے بھائیوں یا بھائیوں نے محض اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ جناب کے حرم خاتون میں آمد و رفت کر کے ان کی کے لیے کوئی اچھی بی بی یا حرم دھونڈ کر نکالیں۔ کیونکہ ایسے معاملات بغیر خاتون کی وساطت کے عین اجرا پاسکتے۔ اور وہ کسی حسین دوشیزہ کو اپنی خوشی و مرضی کے

موافق پاکے اُس کے ناک نقشہ کی بہت اچھی تصویر اپنے لفظوں میں دکھا دیتی ہیں
ایسا ہوا تو اس صحت کے بعد درخواست پیش کر دی جاتی ہے۔ مالک قیمت بتاتی ہے۔ اور
اگر اس پر فریقین رضی ہو گئے تو وہ لونڈی اپنے نئے گھر میں لائی جاتی ہے۔ اور اکثر
اوقات مکاتب کی حیثیت میں آتی ہے لیکن اس اقرار نامے کے ساتھ کہ تھوڑے
زمانے کے بعد وہ آزاد ہو جائے گی اور اُس کے ساتھ مالک نکاح پر حائل ہوگا۔

ایک پردیس کی یاد وطن

لیکن کسی طرح سے لگتی نہیں طبیعت
یاد وطن سے دل کو ہوتی ہے سخت و سخت
پیارے وطن سے پیاری کوئی نہیں ہے
سودا بھرا ہوا ہے اپنے وطن کا سرین
لگتا نہیں کہیں جی بسکے بس اپنے گھر میں
پیارے وطن سے پیاری کوئی نہیں ہے
دوڑے چکورا رہا جس رخ کن کی جانب
کھینچا ہے دل ہمارا اپنے وطن کی جانب
پیارے وطن سے پیاری کوئی نہیں ہے
پردیس کی ہر اک شے ہے اپنی دلچسپی
پیارے وطن میں اپنے ہے کچھ ادا زلی
پیارے وطن سے پیاری کوئی نہیں ہے
یعنی وہ گھر ہمارا چھتر پڑا پڑا
بہتر ہے سوئے ہے وہ گھر مرا پڑا
پیارے وطن سے پیاری کوئی نہیں ہے
جنتاب جو کے جاگوں غم سے مثل آہو
آسان تجھ کو سب کا رہے اسے خدا تو

پردیس میں ہے کیا کیا سامان عیش و راحت
وہ دن کی زندگی ہے کاٹنا مصیبت
آرام چین اپنا دنیا میں بس توں ہے
کاٹنا بھی اُس جگہ کا گل ہے مری نظریں
تاثیر ہے کچھ اُس کے دیوار اور دریں
آرام چین اپنا دنیا میں بس توں ہے
سرت سے تک رہی ہے بل چین کی کجا
پروانہ اڑ رہا ہے شمع لگن کی جانب
آرام چین اپنا دنیا میں بس توں ہے
ہم نے تمام دنیا سو بار دیکھ ڈالی
وہ چیز ہی نہیں ہے دل کو بھانے والی
آرام چین اپنا دنیا میں بس توں ہے
بلجائے مجھ کو بار بار وہ جھونپٹہ اترانا
وہ سال خوردگیل وہ بستر اترانا
آرام چین اپنا دنیا میں بس توں ہے
چل جائے مجھ پر یا رب جب وطن کا جادو
پیارے وطن کو دیکھوں پھر پھر کے میں ہر کو

پیاے وطن سے پیاری کوئی زمین نہیں ہے
 اجڑا ہوا گھر و تہہ ایک گلستان ہے میرا
 میں کیا کمون کہ گیسپا سپارامکان ہے میرا
 پیاے وطن سے پیاری کوئی زمین نہیں ہے
 حادسین قادری از تجھ اوان ضلع مراد آباد

آرام چین اپنا دنیا میں بس وہیں ہے
 مرقہ بھی بس وہیں جو مولہ جہان ہے میرا
 وہ خانہ باغ ویران باغ جنان ہے میرا
 آرام چین اپنا دنیا میں بس وہیں ہے

عندلیب اور کرک شب تاب

کرتی تھی قریر کو اپنے زمزمہ سے شاد کام
 بند اُس کی زمزمہ خوانی نہیں لیکن ہوئی
 شدتِ جوع و عطش سے ہوئی وہ بدحواس
 تو نظر آئی زمین پر ایک شئی سی ناگہان
 کرک شب تاب اُس کی ضوت سے وہ سمجھی مگر
 جی میں تھا لقمہ بنائے کرم کو منقار سے
 کچھ عجب معجز بیانی سے مخاطب یوں ہوئی
 جان میری جیسی ہے مقتون نو کی عندلیب
 جیسی لہرتے ترے نغمہ کی ٹٹنے سے مجھ
 روشنی جھکو عطا کی تجھ کو خوش الحان کیسا
 اور شب کی بھی بہار افزائی ملکر کر سکیں
 کرک شب تاب کی دل سے ہوئی جھٹک
 کر لیا بلبل نے اپنے کھانے کا کچھ اور ساز
 اپنے اپنے نفع اصلی کی کوئی صورت کریں
 تار میں محفوظ آتے ہر اکے جہان ڈال

عندلیب خوشنوا اک صبح سے تا وقتِ شام
 ہو گئی کو چرخ سے زائل شوق کی روشنی
 ایسی حالت میں لگی محسوس کرنے بھکیلیں
 گرد اپنے اک نگاہ شوق سے دیکھا وہاں
 ظلمتِ شب میں جگمگاتی تھی وہاں کچھ فصل پر
 بس زمین پر اُتری وہ شادخ گل بھارت
 کرک شب تاب نے یہ چال اُس کی تازی
 کاش میری شمع کا پروانہ بنتی عندلیب
 ہوتی نفرت سی مرے برابر دو کر نہیں بچے
 کیونکہ یہ ہیں ایک ہی صانع کے انداز واد
 نغمہ و ضو سے جہان تا ہم مسخر کر سکیں
 جب شئی بلبل نے یقیناً مگر محسوس ہوئے
 کر دیا اُس کو رہا اب کلک ہے مضمون طراز
 جنگ جو ہمارے حامل بس ہے کچھ عبرت کریں
 بجائی بجائی سے نہ آپس میں کریں جگمگ جہاں

پیارے دل جل کے گاہیں جگمگاتے حیات
 زندگی کی مولیر آرام سے غربت کی لات

بد اللہ ومان - کلکتہ

بادشاہ بروں اور عنکبوت

شبہ بروں اسکا ٹینڈ کا بحر غم میں ہو کے غرق
تھا وہ بیشک تابور تھا تاج ذوقین زیبے تن
اک مہم سر کرنی تھی منظور اُس کو لاجواب
سعی پلے درپلے تو کی لیسکن رہا نا کا میاب
ہو رہا تھا ایسی حالت میں وہ ہونٹاں
چند لمبے بعد دلیں آگیا جو کچھ خیال
عین اُمیدم گر پڑی اوپر سے دانِ عنکبوت
ارک کے شاہ اپنے خیالوں سے ہوا محسوس
تھا زمین سے فاصلہ کبند کا بس دور و دراز
شہ کو آتا تھا نظر لاجل معشہ سایہ راز
ارنگے ہی وہ لگی خود اُچھٹ کرتا رہے
گر زری وہ منہ کے بھل فوراً زمین پر باہر
ہو گئی لیکن وہاں اُدھر کو فوراً تیسند تیز
پھر پھیل کر رہی لب پر فغان درد و خیز
ہو گیا دورانِ سر جب دور اُٹھ کر بھر چلی
جل رہی تھی جید ہا ریک لہ تھی تاریکی
پھر گری وہ کھائے چکر گرچہ فرش خاک پر
تیر گا ہے سست گا ہے گاہ سینچے گاہ فوق
بالیقین شہ نے کہا اب بواہوس کوڑی بھی
بارا جب کوششیں چڑھنے کی اوپر کھلی
ایک پھر اوپر چلی ایک بار دیکھو جو صحنے
ڈیڑری بالشت پر ہے اب در اُمید سے

کنج تنہائی میں آکر پڑ رہا قفسہ جگر
بیٹھا جاتا تھا سادلِ مایوس اندر سے مگر
خوش رعایا تاکہ ہوں بیٹھے لگائے تھے جو اس
ہو گیا تھا اس لیے اسوقت وہ بجاؤ اس
شدت جوشِ الم سے تھا بہت زار و زور
بولا اب میں جھوڑوں کا منصوبہ سب کا رویا
ایک تار و پسی میں تھی لٹکتی بر ملا
دیکھو تو کوڑی میان کرنی ہے آج کیا بھلا
قطع منزل کا ذریعہ اُس پہ اک باریک تار
اپنے آسائش کے گھر تک پائی کیوکر بار
سخت کوشش سے چلی آخر براہِ مستقیم
جس جگہ پہلے ہوئی تھی چند لمحہ کو مقیم
بٹھری دم بھر بھی نہ وہ تاکوئے شکوہ کی
سر میں کچھ چکر لٹا تھا ظاہر غشی کے کچھ نشان
آدھ گز پہلے سے بھی اوپر کیا اُسے سفر
راہ پھر ایسی کہ تھک جاتی تھی وہ ہر گام پر
زود تر ہمت سے لیکن ہو گئی فوراً حوا
چھ دیر نہ ہوئی یقین کوششیں اُسکی شمار
پھر بلند ہی طرف زہار جانے کی بین
اُدھر لٹ کر آ رہی ہر بار وہ سولے زمین
اُف کیسی تھی گھڑی بہر دلِ صرست تاب
حیف تو نا کام اب بھی ہو گئی یکایاب

یعنی تھوڑا تھوڑا اوپر کو وہ بڑھتی ہی گئی
 پہنچی منزل گاہ مقصد میں یہ میں و فرخی
 پائیک عزت کا تمغہ دل سے ان سماعی جو میں
 فتح کر لی اُس نے لون رہا لوگ کس طرح میں
 مائل رہیں بیان نے اس طرح کی ہے خبر
 اور صف اعدا کو اُس نے کر دیا زیر و زبرا
 تم نہ عاشا کیو مجھ سے ہو نہیں سکتا یہ کام
 سوئے پاس جو حسرت و ناکامی و تزلزل و دام
 بدر الزمان - کلکتہ -

تین جوادرتین جو تھم تھم کے استقلال سے
 کی بھیبت جرات سے جب تھام لیا کتر باغ
 آفرین صاف آفرین کا نعرہ مارا شاہ نے
 یاس کے چھکے چھڑائے واہ لے لکھتے
 والی اسکا ٹینڈ نے پھر کیا باجھنم عزم
 پھر گیا بھمبر بہ کھت وہ جانب میدان رزم
 گوش دل سے سن رکھو یہ نکتہ پایا ہے نظریں
 بزدلی کا کلمہ تم کو لے نہ جائے پھر کہیں

قدرا فرمایا دلگداز

دلگداز کی اشاعت میں ان دنوں بہت کچھ بد نظمی رہی - جس کے اسباب کا
 ظاہر کرنا بھی بے نتیجہ ہے - لیکن اب ایسا اہتمام اور انتظام کر دیا گیا ہے کہ سب
 پرچہ جلد ہی شائع ہو جائیں اور آئندہ پرچہ وقت پر پہنچتے رہیں -
 اپریل - مئی - اور جولائی کے پرچہ عنقریب حاضر ہوں گے -

المتمس فیمبر دلگداز -

✓ دولت

لوگ کہتے ہیں کہ وہ دولت اندھی ہے۔ انہی بنا پر خیال آ رہا ہے کہ سلف نے دولت کی تصویر اندھی بنائی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی معشوقہ ہے جو اکثر نا اہلون ہی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ اور اُن لوگوں کے پاس زیادہ سرمایہ دیکھا جاتا ہے جو نہ اُس پر قابو پانے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ اُس کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔

مگر ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ دولت کی تو بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ لیکن ہاں جن لوگوں کے پاس وہ بہشت و جنت پہنچ جاتی ہے، انہیں اللہ ہاں دیتی ہے۔ چار مہینے اور یہ حالت ہو گئی کہ نہ اپنا پرایا بچھائی دیتا ہے۔ اور نہ اپنا نیک دید نظر آتا ہے۔ فحشی اور نوعی منافع سے نظریے ہٹتے ہٹتے شخصی اور ذاتی مسرتوں کے تنگ دائرے میں محدود ہو جاتی ہے۔ اور پھر سوا اُس کے کہ ہم دنیا کی ہر جائز و ناجائز لذت کا مزہ اٹھا لیں اور کسی بات کا خیال نہیں رہتا۔ تمام انسانی اخلاقی جو انسانیت کا زیور ہیں حلقہ سے گزر کے معائب بن جاتے ہیں۔ اور وہی چہرہ جو خوبصورت اور روشن تھا ہوا اور ہمارے ایک نظر آنے لگتا ہے۔ خود داری غور و بین جاتی ہے۔ اور خدا کی نعمتوں سے فیضیاء ہونا نفس پرستی کی شان دکھانے لگتا ہے۔

ردیہ اگرچہ اُجلا اور روشن ہے۔ اور ظاہر میں کسی حسین کا گورا چہرہ نظر آتا ہے مگر اُس میں ایک ایسی سیاہی بھی ہے کہ اگر دیر تک ہاتھ میں رکھیے تو ہاتھ کالے ہو جاتے

ہیں۔ یہی کالک اگر احتیاط نہ کی گئی تو ہاتھوں سے بڑھ کر منہ میں لگ جاتی ہے۔ اور دولت مندوں کی صورت ایسی بنا دیتی ہے کہ سوا غرض والوں کے کسی کو بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ اُس سے بہتر اور نمایاں کرشمہ دولت کی دورخی حالت کا نہیں نظر آ سکتا۔

اگر اہل عالم کی غرضیں دولت والوں سے نہ اٹکی ہوتیں تو شاید اُن سے بُرا کوئی نہ ہوتا۔ اور کسی گروہ کی اتنی مذمت نہ کیجاتی جتنی کہ دولت مندوں کی۔ مگر دولت ایسا جادو ہے کہ اپنے مالکوں ہی کو خراب اور بد صورت نہیں بناتا بلکہ گرد و پیش کے تمام لوگوں کو بھی جھوٹا خوشامدی۔ ذلیل اور سفلہ بنا دیتا ہے۔

لیکن خوشامد کرنے والوں کے اس کثیر التعداد گروہ کے موجود ہوتے بھی دنیا میں دولت والوں کی جتنی مذمت کی گئی ہے کسی کی نہیں کی گئی۔ اہل دل اقیانوسین نے اُن کو اس قدر ذلیل خیال کیا کہ اُن کے قریب سے بھی احتراز کیا۔ اور محترم بننے کی ہدایت کی غلط فہمیاں اس نفس پرست گروہ کی مذمت میں دفتر سیاہ کیے شعرا نے اپنی غرض نکالتے وقت اگرچہ دولت مندوں کی تعریف میں بڑے بڑے قصیدے کہہ ڈالے مگر جب اپنی غرض نکال چکے تو بھین کیوں۔ اور صاحبان دولت کو جی کھول کے گالیان دیں۔

ایک با مذاق شاعر دولت کی تعریف میں خوب کہہ گیا ہے کہ
اے زر تو خدا نہ دیکھیں بجزا ستار عیوب کا قاضی الٰہا جاتی
اس تعریف کو سن کے شاید کوئی بے وقوف دولت والا بھول گیا ہو۔ اور اپنے دل میں خوش ہولیا ہو۔ لیکن اگر وہ عقل سے کام لیتا تو سمجھ جاتا کہ اس سے زیادہ بھو ملیح نہیں ہو سکتی۔

تم دیکھتے ہو کہ اہل عالم کی عام بد اخلاقی منہ رشوت ستانی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اپنی دنیاوی زندگی میں ہر شخص کو کبھی نہ کبھی رشوت ضرور دینی پڑتی ہے۔ حدت میں۔ ریلوے آفس میں۔ ملازمت میں۔ تجارت میں غرض ہر اسلوب زندگی میں ہمیں رشوت لینے والوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ مگر سب سے بدتر اور نہایت ہی ناپاک قسم کی رشوت دینے والا امر اور دولت مندوں کا گروہ ہے۔

یہ لوگ ہر قسم کی بد اخلاقی اور شہوت پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں مگر رشوت دے کے دنیا والوں کی زبان بند کرتے اور اُسے اپنی تعریف کراتے ہیں۔ شب و روز سخت ترین زنا کاری میں منہمک رہتے ہیں۔ اور روپیہ کے زور سے مشہور کیا جاتا ہے کہ بڑے عقیف و پارسا ہیں۔ شراب گلگون کے جام لڈھائے جاتے ہیں۔ جب دیکھتے غمور و بدست نظر آتے ہیں۔ مگر گرد و پیش کے غرض باد لے و استگان دامن کتے پھرتے ہیں کُرفس زیادہ پاک مشرب کوئی درویش و ولی بھی نہیں ہوسکتا۔ جاہل رحمت ہیں مگر اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مصنفین کو ایسے پرل جاتے ہیں جن کے تصانیف رشوت دے کے حاصل کیے جاتے ہیں اور دنیا میں مشہور ہوتا ہے کہ آپ بڑے زبردست محقق اور سب سے بڑا مصنف ہیں۔ مشاعری سے مس نہیں۔ سامنے بٹھا کے ایک مصرع کلائے تو نہ کہا جائے گا۔ مگر گرد کے خوشامدی شاعر و ن کو رشوت دیدے کے اُن کا کلام مول لیتے اور بڑے بلند خیال و نازک طبع شاعر بن جاتے ہیں۔ یہ تو چند گنتی کی باتیں تھیں دولت والوں کو صرف دولت مندی اور رشوت دینے کی استطاعت کے ٹھیل میں ہر قسم کے دینی و دنیوی کمالات حاصل ہو جاتے ہیں۔ کسی فن اور کسی ہنر کا شوق ہو آپ کی طبیعت اُدھر آئی اور بے پڑھنے لکھنے کی زحمت اٹھائے۔ اور بغیر محنت و مشقت کے فرید روزگار باکمالوں میں آپ کا شمار ہو گیا۔

الفرض بھی کر ایسے کے اور دوسروں سے خریدے ہوئے کمالات ہیں جنکو شاعر نے بالاختصار ”سثار عیوب و قاضی الحاجاتی“ کے وسیع و جامع الفاظ میں جمع کر دیا ہے۔

دنیا میں دو قسم کے دولت مند نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے دولت کو ذاتی کو شمش اور خود بینی محنت و مشقت سے حاصل کیا ہے۔ دوسرے وہ جنکو دولت و رشتمین اباعن جد ملتی چلی آئی ہے۔ یا یوں کہیے کہ جنھوں نے دولت و شمت کے تحوش میں پرورش پائی ہے۔ اور پوتڑوں کے رئیس ہیں۔

اول الذکر طبقہ امر میں بہت سی خوبیاں ملین گی۔ اور اُن میں سے اکثر ذاتی جوہر کے زیور سے آراستہ ہیں۔ ان لوگوں میں ہر قسم کے کالمین اور وہ افتخاران عالم ملین گے جن کے ہاتھوں سے دنیا ترنی کر رہی ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ

لوگ دولت کے ذریعہ سے کمالات نہیں حاصل کرتے۔ بلکہ کمالات کے ذریعہ سے انہوں نے دولت حاصل کی ہے۔ اور روپیہ اگرچہ اُن کے ہاتھوں میں ہے مگر اتنے دنوں تک ٹھہرنے نہیں پایا کہ ہاتھ اور منہ کالے ہو جاتے۔

لیکن اُمرا کا آخر الذکر طبقہ نوع انسانی کا وہ ناپاک گروہ ہے جو برائیوں اور بد اخلاقیوں کا سرشمہ ہے۔ جس طرح گرمی اور روشنی کا منبع آفتاب ہے۔ پانی کا سرشمہ سمندر ہے۔ اور ہر قسم کی دھماکات کا مبداء اُسکی کان ہوا کرتی ہے۔ اُسی طرح تمام برائیوں اور بد اخلاقیوں کا مخزن و مرکز ابن خاندانی دولت مندوں کا ناپاک گروہ ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا میں کوئی بُرائی بھی نہ ہوتی۔ اور اِن کا ناپاک اثر نہ پڑتا تو دنیا انسان صورت فرشتوں سے آباد ہوتی۔ انسان میں اُن ہون اور بدکاریوں کے جذبات بیشک شیطانی قوت نے پیدا کیے ہیں جس کی بنا پر وہ مردود ہے اور اُس پر لعنت کی جاتی ہے۔ مگر مروجہ دولت وائی دولت وائے اُن تمام برائیوں کو قوت سے فعل میں لائے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو دنیا کے اخلاقی بگاڑ کے اصلی ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ روپیہ انکے پاس ٹھہرا ہے۔ اُسکی سیما ہی نے اُن کے ہاتھ اور منہ کالے کر دیے ہیں۔ اور یہ کالک جسم کے اندر دینی حسرت تک اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ اندر دینی جذبات اور اخلاق سب تاریک ہو گئے ہیں۔ وہی سیما ہی اُن کی آنکھوں پر بھی اثر کر گئی۔ جس کی بدولت دولت و دولت کو الزام لگا گیا۔ اور وہ بدنام ہوئی۔ حالانکہ اصلی اندسے یہ ہیں۔ کسی نے شراب کی عیب پوشی میں یہ شعر کہا ہے۔ اور خوب کہا ہے کہ

سے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است بلکہ نے می شود از صحبت ناوان بدنام
یہ شعر شراب کی حالت پر اتنا صادق نہیں آتا جتنا کہ دولت کی بدنامی پر صادق ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہم اس شعر کو یوں پڑھتے ہیں کہ

ز کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است بلکہ ز می شود از صحبت ناوان بدنام
خاندانی دولت مندی کی اس آفت کو ہم ہی نے نہیں محسوس کیا۔ بلکہ دنیا قدیم الایام سے محسوس کرتی آئی ہے۔ اسی نے ساسانیوں کی ناپاک حالت اور اُن کی بد اخلاقیان دیکھ کے مُردک کا فرقہ پیدا کیا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ پانی۔ ہوا۔ اور روشنی وغیرہ کی طرح دولت بھی خدا کی اُن نعمتوں میں سے ہے جن پر کوئی اپنا قبضہ نہیں جتا سکتا۔ بلکہ ہر شخص اُس سے یکساں طور پر نفع اٹھانے کا مجاز ہے۔ وہ لوگ

طبقہ اول کے دولت مندوں کے مخالف نہ تھے۔ کیونکہ وہ اپنے فضل و کمال اس لئے ذاتی جوہر اور اپنی محنت و مشقت کے صلہ میں دولت حاصل کرتے ہیں۔ اُنہیں جو کچھ ملتا تھا صرف دوسرے طبقہ والوں یعنی موردنی اہل دولت سے تھا۔ جو باب یا کسی وارث کے مر جانے سے دولت کثیر کے مالک ہوتے۔ اور اُنکے ذریعہ سے ہر قسم کی بد اخلاقی اور شہوت پرستی کو اپنے لیے جائز کر لیتے ہیں۔ مزدک سے صرف اتنی غلطی ہو گئی کہ عورت کو بھی اُس نے جائداد میں شامل کر لیا۔ ساسانیوں کے زمانے میں چونکہ لونڈیاں محلوں میں بھری جاتی تھیں۔ اور ساسانیوں سے پہلے بابل و فینو والوں میں چونکہ عام عورتیں بجا عقد نکاح کے فروخت کی جاتی تھیں اس لیے اُن دنوں کسی معنی سے ایسی غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

نیز اسلام کے ظہور کے بعد خود اسلام کے دامن میں خواجه - قرامطہ - ملاحدہ - اور بابی وغیرہ کی قسم سے جو فرقہ پیدا ہوئے اُن کی بنیاد بھی اسی بات پر تھی کہ خاندانی دولت مندی کے مخالف تھے۔ یونان و روم کی جمہوریت بھی اسی خیال کے تقاضے سے ظاہر کی۔ اسی کے فیصل میں انگلستان کے سربراہ اسے یہ جبر و اکراہ میگنا چارٹا کا دستور العمل فرمان فرامانی و تحفظ کرایا گیا۔ اور اسی نے فرانس کی شاہنشاہی کو پامال کر کے جمہوری سلطنت قائم کی۔

خلاصہ یہ کہ خاندانی دولت مندی کے مٹانے کا مسئلہ دنیا میں اکثر پیدا ہوا۔ اور متحرک و بہت اثر بھی دکھایا۔ لیکن چونکہ حکومت ہمیشہ دولت مندوں کے ہاتھ میں رہی۔ وہی حکمران تھے اور وہی عہدہ داران سلطنت۔ جنہیں دولت نے اندھا بنا دیا تھا۔ جو دنیا کی عام اصلاح کو ہمیشہ اپنی خود غرضی پر قربان کر دیا کرتے تھے۔ اس لیے پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی

جب زیادہ حیرت کی یہ بات ہے کہ دین اسلام بھی اپنے اصول و آئین شریعت سے اس امر کی مساعدت کرتا ہے کہ دولت کسی گھرانے میں جمع نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ہمارا قانون وراثت اس کی پوری تصدیق کر رہا ہے۔ آج کل کینٹ اور ٹیلر لوگوں کی طرح اسلام یہ توہین کہتا کہ ہر دولت مند کے مر جانے بعد کسی کل جملہ اہلک پر برابرٹی ہو جاوے۔ لیکن دیگر اقوام کے قوانین وراثت کی طرح اُس نے یہ بھی نہیں کہا۔

کہ نوروتی اور آبائی جائداد صرف اولاد اکبر کو دیا جائے اور باقی لوگوں کو گوارہ ملے اس نے بہت سے ورثہ نگاری ایک فرسٹ تباری - اور حکم دیا کہ اس نسبت سے یہ جائداد ان سب وارثوں میں تقسیم کر دی جائے - جس تقسیم کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ چاہے کتنی ہی بڑی جائداد جو چند پشتون کے بعد دیکھئے تو نوع انسان کے ایک وسیع دائرے میں پھیل جاتی ہے اور آبائی دولت مندی کا سلسلہ ہمیں قائم رہنے پاتا - نئے دولت مند پیدا ہوتے رہتے ہیں - اور پورے اصول دولت کی کوشش سے بے پروا نہیں رہ سکتے -

لیکن سلطنت اور امارت چونکہ آبائی دولت مندی کی طرف اشارہ ہے اس لیے بار بار کوشش کی گئی کہ اس قانون وراثت میں ترمیم ہو جائے مسلمان تعلقداران اور دھرم کی وراثت سے اسلام کی برکتیں اٹھائیں - اور انھوں نے محض نو غرضی کے جوش میں اسے خوشی کے ساتھ قبول کر لیا - اور بعض نا سمجھ لوگ جو شریعت اسلامیہ کی اصل برکت - اور اس کے پیچھے غرض سے ناواقف ہیں اب بھی کبھی کبھی غل مجا دیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا عام قانون وراثت بدل دیا جائے -

یورپ کی آزاد دیون اور ترقیوں نے اگرچہ دنیا کی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے مگر اب بھی وہاں خود غرض دولت مندوں کا اثر اس قدر غالب ہے کہ لبرل گروہ جو دولت مندی کی قوت توڑنا چاہتا ہے مغلوب ہے - اور روز بروز مغلوب ہوتا جاتا ہے اور انگلستان کی ایسی ہی سچہ اور قوم میں بھی ایسی ہی کم کا ضبط بڑھ رہا ہے - جو لوگ استعمال دولت میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں باغی قرار دیے گئے ہیں - اور ان کی پیروی کی کوشش کی جاتی ہے -

لیکن اگر زمانہ کی یہی رفتار ہے تو ایک دن ساری دنیا پر یہ ضروری قانون حکومت کر رہا ہوگا کہ نہ لیاقت و جوہر کے صلہ میں یا اپنی محنت و مشقت سے دولت حاصل کرنے والے اپنی زندگی بھر اس سے نفع اٹھانے کے مجاز ہیں - لیکن ان کے مرنے کے بعد دولت کسی خاص وارث کی ملکیت نہیں بلکہ بلکہ جائداد ہے جسے سلطنت کا جمہوری انتظام قومی و ملکی مصلح میں صرف کرے گا -

اس مبارک وقت کے آنے کا پہلا درجہ یہ ہوگا کہ ساری دنیا سے شخصی حکومت کی خواہش دور ہو جائے گی - اور دوسرا درجہ یہ ہوگا کہ دولت بلکہ پراپرٹی کی ضرورت دور ہو جائے گی - اور وہی شامبارک وقت ہوگا جب کابل امیر زادوں کو نہ شہوت رانی کے لیے دوسرے ملک

نہ ہے پرستی کے لیے۔ اُن کی دست برد سے غربا کی عزت و آبرو محفوظ ہو جائے گی۔ نہ کسی کے پاس اتنا روپیہ ہو گا کہ رشوت دیدے کے لیے تصنیف کے مصنف بنے بے شعر کے شاعر بنے۔ اور بد اخلاقوں میں مبتلا ہو کے سراپا اخلاق مشہور ہو۔ اُس غیر برکت کے دور میں مزدور کو اپنی پوری مزدوری ملے گی۔ اور محنت کرنے والا اپنی محنت کا پورا پل پائیگا اور ہر شخص کو اُنسی چیز میں شہرت حاصل ہوگی جس میں وہ حقیقتہً کمال رکھتا ہے۔ اور اُسی وقت نظر آئے گا کہ دولت اندہی ہے یا وہ لوگ جو بے محنت و مشقت اُسے حاصل کر لیا کرتے ہیں۔

خاتونان عرب کی عفت

یہ بات خاص عربوں میں ہے کہ لڑکیاں اگرچہ بظاہر بیک نظر آتی ہیں۔ اور بے تکلفی میں اس قسم کی باتیں کہہ جاتی ہیں جو ہندوستان میں انتہا درجہ کی میشرمی اور بیچڑمتی کا نمونہ خیال کی جائیں لیکن اسکے ساتھ ہی عقیفہ اور پاکدامن ہوتی ہیں۔ شعراء عرب شریف زادوں پر اظہار عشق کرتے تھے۔ اپنی نظموں میں معشوقہ کا نام لے کے بیان کرتے تھے کہ فلان تاریخ شب کو میں اُسکی خواب گاہ میں گیا۔ اُس سے یہ باتیں ہوئیں۔ اور وہ مجھ سے آغوش عشق کھول کے یوں ملی۔ پس کس اس پر بھی اُن کے چال چلن پر حیرت نہیں آتا تھا۔ بدایک شاعروں کو ایسی جرات بھی ہو گئی کہ جو رکی طرح معشوقہ سے ملے۔ خلوت میں اُس کے ساتھ بیٹھے۔ اظہار عشق کیا۔ گھل مل کے باتیں کیں۔ اور بغیر اسکے کہ بدکاری کا خیال بھی دل میں گزرے واپس چلے آئے۔

اس قسم کے مدعا واقعات ہیں جو دیگر اقوام و ممالک میں حیرت و تعجب کے کیے جاتے ہیں لیکن اہل عرب میں وہ معمولی باتیں محققین۔ اور ایسی نہیں کہ اُن پر چٹکانی کی جائے۔ منجملہ اُن کے نبی قضاہ کا ایک یہ واقعہ ہے جس کا بیان کرنا ہمارے ناظرین کے لیے لطف سے خالی نہ ہوگا۔

نبی قضاہ میں ایک شریف و صاحب اثر شخص تھا۔ خدا نے اُسے سات بیٹے دیے تھے جن میں سے ایک بنایت ہی حقیر و کمزور شکل و شمائل میں بنایت ذلیل تھا۔ خاندان کی یہ خدمت اُس کے سپرد تھی کہ اُونٹ چرایا کرتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا گھر کا غلام

ہے۔ اتفاقاً ایک اونٹ بھاگ گیا۔ بھائیوں نے کہا ”جاؤ اُسے ڈھونڈو لاؤ“ اُس نے کہا ”کیا میں ہی ہوں؟ تم نہ جاؤ؟“ باپ نے یہ جواب سن کے کہا ”ابے جاتا ہے کہ نہیں؟ ذرا بھی دم مارا تو اسی وقت مار کے ڈال دوں گا“ مار کا ڈر بڑا ہوتا ہے آپ مجبوراً اونٹ کو تلاش کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔ سردی کا موسم تھا۔ بھوکے پیاسے اور جاڑے کی شدت سے کانپتے ہوئے صحرانوردی کر رہے تھے کہ شام کو بدویوں کے ایک خیمہ کے پاس پہنچے جس میں ایک نیک بڑھیا ابی حسین دہری جال بیٹی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے ترس کھا کے کھلایا پلایا۔ اور ٹھہرا لیا۔ جب بڑھیا کام کاج کے لیے وہاں سے بھی توڑکی نے آپ کی عجیب صورت دیکھ کے بنا نا ادھر سفر ہین کرنا شروع کیا۔ کہنے لگی ”میں نے تم سے اچھا خوبصورت اور بانٹکا جوان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک کام کرو۔ جب رات کو سب سو جائیں تو تم چپکے سے اٹھ کے میری خوابگاہ میں چلے آنا۔ اُس وقت ہم تم اطمینان سے باتیں کریں گے“ آپ سمجھ گئے کہ بناتی ہے۔ بولے ”مجھے بتائیے۔“ ”بنائیے مین“ اتنے میں لڑکی کا باپ اور اُس کے سات جواہر دو تھیں بیٹے آگئے۔ سب نے کھایا پیا۔ اور خیمہ کے سامنے زیرِ سما سو گئے۔ جب سب لوگ غافل ہو گئے تو شیطان نے آپ کو انگلی دکھائی۔ اگرچہ جانتے تھے کہ لڑکی نے صرف بنایا تھا مگر دل نے نہ مانا۔ چپکے سے اُٹھے۔ دبے پاؤں خیمے کے اندر گئے۔ اور لڑکی کو تنہا اور غافل پا کے آہستہ سے جگایا۔ اُس نے آنکھ کھولتے ہی پوچھا ”کون؟“ بولے ”میں ہی ہوں تمہارا غریب اوطن حمان“ ”چین بے چین ہو کے اُس نے کہا ”کیون شامت آئی ہے؟“ ”نیکل مل سے اور دُور ہوا! گھبرا کے پلٹے۔ ڈرے اور سسے ہوئے چپکے چلے آتے تھے کہ کتنا خیمہ کے پاس رہا کرتا تھا بھونکتا ہوا جھپٹا۔ آپ نے اپنی لکڑی سے ہزار مٹایا۔ مگر وہ بھلا کب ملتا تھا؟ لپکے لپکے آہکا دامن کڑھ ہی لیا۔ اب اُسے آپ اپنی طرف کھینچ رہے تھے اور وہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس کشش میں آپ نے ایک دفعہ زور کر کے پیچھے کھینچا تو اڑڑا اور حریف کر کے ایک اندھے کنوئین میں جا رہے جو پیچھے تھا۔ اور ساتھ ہی وہ کٹا بھی دامن کے ساتھ کھینچ کے کوئین میں آ رہا۔

دعا کے کی آواز اُس حسین دہری جال دشمنہ کے کان میں گئی تو خدا ترسی سے اُٹھی۔ اور کنوئین کی جگت پر آ کے کہا ”خدا کی قسم جی تو یہ چاہتا ہے کہ اسی کنوئین

کو تیری قبر بنا دوں۔ لیکن خدا سے ڈر کے پتھر کی جان بچاتی ہوں۔ یہ کہہ کے اُس نے سٹی ڈولی - اور کہا اسے پکڑ لے۔ اور پرتک پہنچنے کے لائی تھی کہ طاقت نے جواب دیدیا۔ اور ایسے قدم اکھڑے کہ خود بھی کنوئین میں جا رہی۔

اب صبح ہوئی۔ اور لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ لڑکی خیمہ میں سے خانے - اور صبح اُدھر دھونڈھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا لڑکی وہ نوعمر مہمان - اور کٹائی تھوئی کنوئین میں ہیں۔ غیرت و حشمت جوش میں آئی۔ اور باپ بھائی سب کے سب ننگی تواریں اور تھوڑی کے بٹے بٹے جہاز لیکے چھپنے کے دونوں کا کام تمام کر دیں۔ مگر خاندان کے دلیں حم و الدیا کہ جس نے سب کو روکا۔ اور کہا ابھی بچھے بیٹی پر یہ گمانی نہیں اُسکی پاداشی ایسی نہیں کہ بڑا گمان کیا جاسکے پھر سیانہ ال کے سب کنوئین سے نکالا۔ اور نکالتے ہی جھوٹ اور بدبیز مہمان سے کہا تھا کہ قسم میں جانتا ہوں کہ میری لڑکی پاس اور بیگناہ ہے۔ لیکن یہ واقعہ ایسا پیش آیا کہ سارے عرب میں رسوائی ہو گئی۔ اور کوئی اسے اپنے عقیدے میں نہ لگا۔ تم کہو تمہارے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ بی بی کی خبر گیری کر سکو۔ اگر ایسی امید دلاؤ تو اُس لڑکی کے ساتھ تمہارا الحاح پڑھاؤں۔ یوں میں بدنامی سے بچوں گا۔ اور تمہاری آرزو پوری ہو جائے گی۔ ان بچارے کو جان کے لالے بڑے ہوئے تھے۔ منتظر تھے کہ کب سر اڑایا جائے گا۔ بیکار یہ خلاف توقع سوال سنا تو بے تحاشا گھبرائے کہ بولے ”مجھ میں سوا بھلائی کے کوئی خرابی نہیں۔ اور مجھ سے زیادہ نیک شوہر چراغ لے کے دھونڈھیں گے تو بھی نہ ملے گا۔ یہ سن کے وہ خوش ہوا۔ اور بچاؤس اُٹھ۔ ایک لونڈی۔ اور ایک غلام کے مہر پر انبی لڑکی ان کے عقیدے میں دیدی۔

اب آپ کے جوش مشرت کی کوئی انتہاء تھی۔ وہ بھاگا ہوا اونٹ تو خدا جاتے کہاں گیا۔ آپ خوش خوش اپنے گھر گئے۔ اور باپ سے ساری سرگزشت بیان کی جس خاندان میں شادی ہوئی تھی چونکہ وہ معزز و محترم اور شریف تھا۔ باپ نے بھی خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ مہر کی چیزیں لے کے گیا۔ اور ہو کو رخصت کرالایا۔

اس کے بعد مدت تک آپ صحرا سے عرب میں زندہ رہے۔ مسافر اور سیاح آپ کے بیان آکے مہمان ٹھہرتے۔ آپ کی بد صورتی اور آپ کی بی بی کی زیبائی و رعنائی کو دیکھ کے حیران ہوتے۔ اور آپ اپنی یہ آپ بیٹی کہانی سنا سنا کے انہیں خوش اور مطمئن کر دیا کرتے۔

ہم نشین

اے اچھے اور پیارے ہم نشین تجھ سے زیادہ لطف دنیا کی کسی چیز میں نہیں۔ تو ہمارے لیے پیدا کیا گیا ہے اور ہم تیرے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ تجھ سے ہمارا دل بھلتا ہے اور ہم سے تیرا دنیا کی تمام نعمتوں اور عالم کے پُر فضا مقامات کی بیسویں بہین اس وقت لطف آتا ہے جب تو پہلو میں ہو۔ اور تجھے اس گھڑی مزا ملتا ہے جب ہم تیرے پاس ہوں۔ تو نہ ہو تو چاری زندگی بے مزہ ہے۔ اور ہم نہ ہوں تو تیری زندگی شکایات زمانہ کا دفتر تو ہمارے سامنے کھولتا ہے۔ اور ہم تیرے سامنے۔ تو پناہ دے دل میں سناٹا ہے۔ اور ہم تجھے۔

بنال بلبل اگر بابت سر یاری است کہ ماد و عاشق زاریم و کارما زاری است
اس میں شک نہیں کہ دل بے خاہر اپنی تنہاؤں اور آرزوؤں کا خواہنا کھا رہے۔ اور اس بیماری دلربا صورت کو ڈھونڈنا کراتا ہے جو ہمارے مقاصد کا چتر منہ ہے۔ مگر اسکی تلاش میں بھی اگر مزہ آتا ہے تو اس وقت جب تو ہم سفر ہو۔ اور اسکے ساتھ بیٹھنے اور دل کی ہوس میں نکالنے میں بھی جب ہی دل لگتا ہے جب تو ہمارا نہیں صحبت ہو۔ اور ایسا ہی سُن عقیقت ہمیں تیرے ساتھ بھی ہے۔ لہذا اے مولس عکسار ہم نشین تیرے بغیر مشوقہ شیرین ادا کی و لفریبان بھی پھینکی ہیں۔ اور دولت وصل بھی بے مزہ ہے۔

شب ہجران کی نہ کٹنے والی گھڑیوں میں جب دل و حرکت و حشر کے قرار لیتا ہے۔ اور غربت و بادیرہ پائی کی دشوار گزار منزلوں میں جب ہم تھک کے بیٹھتے۔ اور ہر اُمید سے مایوس اور ہر طرز سے وحشت زدہ ہو کے ٹھہرتے ہیں۔ اور زخمی پاؤں سے کانٹے نکالنے میں مشغول ہو کے خیال کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں اس وقت اے ہمارے مولس قدیم ہم نشین سب سے پہلے تو ہی ہمارے پاس آتا ہے۔ اپنی دلفریب باتوں سے دم بھر میں دل بہلا دیتا ہے۔ ساحر خیال کے عامل و موکل ہماری آفت زدگی پر تیرے کھاکے یاران وطن۔ اعدا و اقارب۔ اور مشوقہ پیری جمال تک کو ہمارے سامنے لاکے کھڑا کر دیتا اور اکثر ہمارے پہلو میں بٹھا دیتے ہیں۔ مگر اے کسی صحبت دیرین کے ہم نشین تو خود ہی چلا آتا ہے سب سے پہلے آتا ہے۔ اور دوڑتا ہوا آتا ہے۔

یہ کیوں؟ پہلے کہ تیرے بغیر نہ صحبت یا مزہ کی ہے۔ اور نہ وطن کے بچھڑے ہوؤں کی ملاقات اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم ہر چیز کو تیری نظر سے دیکھتے۔ ہر آواز کو تیرے کانوں سے سنتے۔ ہر خوشبو کو تیری قوت شامہ سے سونگھتے۔ اور ہر مزے کو تیری ہی زبان سے چکھتے ہیں۔

اے دلدار ہم نشین - اگر چہ بے اسکے کہ کسی کا چاند سا چہرہ پہلو میں ہو میں چین چین آسکتا۔
جب تک یہ وفاؤں سے شان و فناء ظاہر ہو دل نہ مانے گا۔ بچھڑوں سے جب تک مل نہیں دل نادان
لو قرار نہ آئے گا۔ اور جتنی حسرتیں دل میں ہیں کل نہیں کی تسلی نہ ہوگی۔ گرچہ کنا عیسیٰ تسکین ہمیں تجھ سے
خطاب کر کے شعور

ہم نشین جب مرے ایم بھلے آئیں گے
بن جائے وہ مرے گھر میں چلے نینگے
بڑھ دینے سے ہو گئی کبھی اور بھی ہوئی تھی؟

ابھی بسببے انسان پر جو اثر اُسکے ہم نشینوں کا ہوتا ہے کسی کا نہیں ہوتا۔ ہم نشین ہمیں
جس رنگ پر لگا دین ہم بے تکلف خوشی کے ساتھ اُسی رنگ میں لگ جاتے ہیں۔ مذاہب و ملل
کی تاریخ پر نظر ڈالو تو صاف نظر آجائے گا کہ جو کام ہم نشینوں نے کیا ہے نہ داعیان مذاہب کی
دعوت کو سکی ہے۔ اور نہ بہادر سپہگروں کی شمشیر زنی۔ جہاد سے ملگ فٹ ہو جاتے ہیں۔ تو میں مغلوب
ہوتی ہیں۔ اور تاج و تخت حاصل ہو جاتے ہیں۔ مگر دل نہ فتح ہوتے ہیں اور نہ ہاتھ میں آتے
ہیں۔ دعوت دین معقول و موجبہ دلیلین پیش کر کے قائل کر دیتی ہے۔ مناظرے کی کتابیں لکھ کر
رکے عاجز بنا دیتی ہیں۔ مگر پھر بھی جی نہیں چاہتا کہ اُس اُصول اور اُس وضع کو اختیار کر لیا جائے۔
دل میں یہی خیال جارہا ہے کہ ہمارا دین و آئین ہمارے لیے۔ اور اُن کا اُن کے لیے ہے۔
یہ بے حیثی ہے کہ غیر دین کی ریس اور دوسروں کا اعتقاد اختیار کر لیا جائے۔

مگر اس کے مقابل اسے انیس صحت ہم نشین خود کو فتح کر کے اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔
تو ہمارے خیالات و عقائد اور ہماری معاشرت پر حکومت کرتا ہے۔ اور تیری اُس بھری پٹی
ہمیں اس طرح لٹھالیتی ہیں کہ گویا ہم اپنی خودی اور اپنی اپنایت کو بھول جاتے
ہیں۔ دنیا کی کوئی چیز ہماری نظر میں ہم سے اچھی نہیں۔ کیونکہ اس عالم میں بڑا مبہلا
جو کچھ ہے ہمارے لیے اور ہماری دلچسپی کے واسطے ہے نہ یہ کہ ہم اچھا ہو۔ مگر اسے
انیس صحت ہم نشین تو بعض اوقات ہمیں اپنی ذات سے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم
بیز رنگ اپنے اوپر بھانپتے۔ اپنی وضع چھوڑ کے تیری روش اختیار کرتے۔ اور اپنے
مذہب سے اگنا کے تیرے مذہب کو اختیار کرتے۔ جتنے کہ اپنی خودی مٹا کے تیرے دم
سے جیتے ہیں۔

مناظرہ کرنے والوں اور رد مذاہب کی کتابیں لکھنے والوں سے کہہ دو کہ

اب اس کا زمانہ نہیں رہا۔ اب اپنی کوششوں سے بجائے نفع پہنچانے کے وہ دنیا میں فساد پھیلا رہے ہیں اُن کی تحریر و تقریر کا نتیجہ اگر کچھ ہے تو فقط اس قدر کہ انہوں میں تعصب بڑھاتے۔ اور غیروں کے دل میں نفرت اور ضد پیدا کرتے ہیں۔ اگر سچی تبلیغ چاہتے ہیں تو انہیں صحبت اور ہم نشینی بن کے ہمیں اپنی طرف بلائیں۔ اور اپنے بن کے ہمیں اپنا بنائیں۔

ہم تم اور سب اپنے ہم نشینوں کے بندے ہیں۔ اور اُنہیں سے پہچانے جاتے ہیں۔ کسی کو اگر ہماری حالت کا سچا اندازہ کرنا ہے تو ہمارے اخلاق و عادات اور ہمارا وضع و اطوار کی جستجو کرنے سے پہلے ہمارے ہم نشینوں کو دیکھئے۔ کیونکہ وہی ہمارا لباس اور ہماری کھلی تصویر ہیں۔ جو جذبات ہم میں مضمر اور پوشیدہ ہیں اُن میں کھلے اور نمایاں فطرت آئیں گے۔ ہماری آرزوئیں اور ہوسیں اُن کی زبان سے ظاہر ہوں گی۔ اور ہمارے ارادے۔ اور ہمارے شوق اُن کے کاموں اور عملوں کے واسطے میں چھپے ہوں گے۔ شاہزادوں اور امیر زادوں کے لیے اچھے اور لائق و فائق استاد ڈھونڈ کر کے ہم پہنچائے جاتے ہیں۔ علمائے گران پایہ سے النجا کی جاتی ہے۔ کا ملان فن تلاش کیے جاتے ہیں۔ مگر افسوس مصاحب اور ہم نشینوں کے انتخاب میں احتیاط سے ہمیں کلام لیا جاتا ہے۔ لاکھ اصلی استاد۔ حقیقی معلم۔ اپنے رنگ میں رنگنے والے۔ اور اپنا سا بنانے والے بھی مجلسِ ہم نشین ہیں۔ اُمراء قوم کے بگڑنے اور انتہا درجہ کی بداخلاقیوں میں مبتلا ہونے کا باعث یہی ہے کہ استاد و معلم سب اچھے تھے مگر مجلسِ خراب و ناکارہ۔ اور ہم نشین بد وضع و بد اطوار تھے۔

نوعمر دن پر منحصر نہیں۔ سن رسیدہ اور خود مختار امر کی ابتدائی بد وضعی اور آخری تباہی کا عام سبب بھی یہی رفیق و ہم نشین ہیں۔ اہل زمانہ ہمیشہ سے امرا اور دولت مندوں کی شکایت کرتے چلے آئے ہیں۔ اُن کی خرابیوں کا اگر آپ پتہ لگا سکیں تو آخر میں یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم نشین اچھے نہ تھے۔ اور اُن میں جن جہت کے ہم نشین و مصاحب اچھے تھے اُنہوں نے دین و دنیا کی ایسی خدمت کی جو ہمیشہ یادگار رہے گی اور اُن کا نام رہتی دنیا تک۔ اور زمانہ پر ثبت رہے گا۔

جلوہ جانان

حسرت دید لیگئی دونوں جگہ کٹان کٹان
رات کے پہلے پہر کا پہلا گھنٹہ ختم ہو چکا ہے آسمانی میٹھا رنور قندیلین نورانی ہو چکی
مین لیسکن یہ قدرتی چراغ جو دھوبین رات کے پورے چاند کے درخشان پر تو سے
کیقدر بے رونق کا عالم دکھا رہے ہیں۔ ہمارے رات کے صاف اور نورانی
ماہتاب کے گرد والے ستاروں کا جھڈاؤں موتیوں کے ہمارے جو کسی خوش نصیب کے
گستاخ ہاتھوں سے ایک چاند کے ٹکڑے کے سینے پر ٹوٹ کر بکھر گیا ہو دھوکا دینا
ہے روشن رات کا منور عالم قابل دید ہے۔

ہم اپنے معزز ناظرین کو یہ روشن اور دلربا منظر بھیجی کی اس عالیشان
فلک نما عمارت کی چھت پر سے جو شہر کے مشرقی شمالی کنارے میں واقع ہے اور جہاں
سے سمندر کا فرحت خیز سین قریب تر پیش نظر ہے (دکھانا چاہتے ہیں۔
یہ تین منزل کی خوبصورت عمارت اسوقت چاند کی شفاف روشنی میں اصلیت
سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی ہے۔ مکان کی شان و شوکت اور ساز و سامان
پر نگاہ ڈالنے سے مکان پرالہ دین والی طلسمی مجلس کا حق بجانب گمان ہوتا ہے۔
ہم سبے ہوئے فردوس پیکر و نکوٹے کرنا بیچ شکل سمجھ کر صرف چھت کے نظارے
پر قناعت کرتے ہیں۔

کھلی ہوئی وسیع چھت و کٹش چاندنی میں بہشت کا صحن معلوم ہو رہی ہے ہلکی
ہلکی چٹائی کریسان پڑی ہیں خوبصورت گولوں میں پھولدار وخت اپنی نفاست
اور رعنائی پر دلربا انداز سے نازان ہیں۔ ہمارے سین کی مشق فی حد وسیع سمندر
سے محدود ہے جو اسوقت چاند کی خوش آئند روشنی میں پارے کے دریا کا
محالہ دکھا رہا ہے۔ رات کی تند سی ہوا کی تحریک سے وقتاً فوقتاً چمکدار
موجیں تلوایں کر اٹھتی ہیں اور پھر ہماری نگاہ سے غائب ہو جاتی ہیں۔ بڑے
بڑے اسٹیمر اور ان کی روشنی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے لیکن زیادہ

فاصلہ کی وجہ سے ہم انکی زیبائش کی داد نہیں دے سکتے۔ گرد کی آبادی ہمارے بلند مکان کا پائین باغ معلوم ہو رہی ہے۔ مکانات کی روشنی۔ اُن کی چیل پیل ہماری نگاہوں کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لیے ناکافی نہیں ہے لیکن چوڑی سڑک پر آئے جانے والی گاڑیوں کی روشنی ٹوٹنے والے ستاروں کی بہار دکھا کر ہمس کو تیسراں کیے ہے ہم رات گئے کھانے کی گھنٹی کی آواز سن کر اس قدر ترقی دلربا ہیں کہ اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہیں۔ بڑے ہال کو جو موجودہ زمانے کی اعلیٰ آرائشوں کا مخزن ہو رہا ہے طے کرتے ہوئے ایک جان لیوا منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ آہ! دنیا میں ایسا جلوہ دیکھ کر انسان کو پھر کچھ نہ دیکھنا چاہیے ہماری طرح ہمارا قاتل بھی گھنٹی کی آواز سن کر ڈانگنگ روم کو جا رہا ہے غارتگر جمال پر آنکھ پڑتے ہی ہم نے تو کیچے پر ہاتھ رکھ لیا لیکن بیقرار دل چپکے چپکے کہنے لگا۔ ۳۔

قد اسر دے تو سودا سے تری زلف پشیمان
جو آنکھیں نے تو نظارہ ہوائی سنبھلتا نکلا
اللہ عالم فریب حسن روز افزون ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ قد اور اسکی عسائی ہماری حسرت کے دریا کی طرح بازو پر ہے آج بے خمدار گیسو متعدد چوٹیوں میں بڑے احتیاط سے گوندے گئے ہیں لیکن پھر بھی یہ ظالم ہمارے آرائش پسند نازنین کے بس کے نہیں ہیں کبھی گورے گالوں پر لہراتے ہیں اور کبھی ابھرے ہوئے سینے پر بڑے پیار سے مل کھاتے ہیں۔ زلفوں کے سیاہ خوبصورت اور شاندار سلسلے پر نگاہ ڈالنے والی کی آنکھوں میں زمانہ کیون نہ تاریک ہو۔

۳۔ تم کہ نہیں کالی گھٹا ہے یا رکی زلف سیاہ
دیکھ لے طاؤس کا فر تو چکانے لگے

روشن پیشانی چاند کے بیدار عکس سے چمک اور صفائی میں کہیں زیادہ ہے نہیں نہیں ہماری رائے غلطی پر ہے چاند کو ہمارے چاند کی پیشانی سے کوئی نسبت نہیں ہے بلکہ اُس کے تلوے چاند سے کہیں زیادہ صاف ہیں ہالے اتنا کون کہے۔ واضح ہے

یاد کھاو مجھے نم پاؤں کا ناخن اپنا
یا یہ کھدو مرے ناخن سے ہلال اچھا ہے

قاتل بڑی آنکھیں شوخی اور شباب کی سستی سے بھری ہیں ہماری بے شوق نگاہ ان لبریز ساغروں پر قربان ہوئی جاتی ہے اور بے پیہ شراب کا سرو ہمارے دل کو مست کیے ہے۔ جگر سے

عالم نظر میں ہے کسی ست شباب کا

رہتا ہے بے پیہ مجھے نشہ شراب کا

گورے بیدار اور نور شباب سے منور عارض باغ حسن میں چوٹی کے پھول ہیں دنیا بھر میں ایسا کوئی دل نہیں جو بلبل کی طرح ان کی محبت میں ہر وقت فریاد نہ کرتا ہو۔ گلاب کے پھول کو اپنے ہلکے نفیس اور نازک رنگ پر بڑا ناز ہے کاش ہمارے رنگین ادا حسین کے خوش رنگ رخساروں سے کسی دن سامنا ہو جائے اور ہم چپکے سے کاغذ اتنا کدین۔

گل عنادل کو مبارک ہیں گلزار دین

جگر سے

ہے وہی رنگ ہی پوتریے رخسار دین

پتلے نازک اور سُرخ مائل ہونٹھ اس دلربا بستم سے چھپ چھاڑ کر رہے ہیں جسے بے قرار دل پر بجلی گرا لے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ خدا کے واسطے اے برقی بستم جلد چمک کر ہمارا کام تمام کر دے تاکہ ہمیں اتنا کہنے کا موقع ملے۔ داغ سے

مسکراے مرے لاشے پہ وہ منہ پھیر کے داغ

حشر تک یاد رہے گا یہ بستم مجھ کو

اوسکرا کر ہماری طرف سے منہ پھیر لینے والے کیا واقعی ہماری جان لینے کی دل میں ٹھکان لی۔ کیا اس جان نشان ادا پر رسم قربان ہو جائیں۔

آہ! او بے مروت خود تیری ترجیحی ترجیحی قاتل نگاہیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں۔ آتش سے

آنکھ تو نے جس سے پھیری دم فنا اس کا ہوا

مردے کے آٹا ز زندے میں نظر آنے لگے

صرف دو منٹ کی جڑو آرائی کے بعد ہی ہمارا دل افروز چاند بڑی خلوت
میں چھپ جاتا ہے اور ہم جو دھوین رات کے چاند کی طرف دیکھ دیکھ کر
کمال حسرت و ناکامی کے عالم میں اپنے کمرے کی دیواروں سے سر ٹکراتے
ہیں اور کہتے ہیں ۔ ۵

چاند سے منہ کو ترسے یاد کیا کرتے ہیں
شب مہتاب میں فریاد کیا کرتے ہیں

آہ! اے قاتل حسین اپنے مشتاق شہادت کو قتل کرنے آنا اور پھر یوں
منہ پھیر کر چلے جانا انصاف کے خلاف ہے ۔ ۵

رفیق بزم یرتغ و نہ مردن گناہ من
برون بزم یرتغ و نکشتن گناہ کیست

راقم جگہ مالک جگر گینی لکھنؤ۔

ایک چھوٹے ذرے کی سرگزشت

میں اپنے تنگ و تاریک کلبہ احزان میں بیٹھا ہوا تھا۔ دماغ شکستہ پتھر کے ٹوٹے پٹارے میں بند تھا۔ اور خیال فضاے عالم کے ناپید اکا سیدان میں اڑتا پھرتا تھا۔ خیال کے راہوار پر سوار ہو کے میں نے گشت شروع کی تو کرات فلکی کے پاس جا پہنچا۔ اور دیکھنے لگا کہ کتنے کتنے بڑے اور کیسے کیسے عظیم اشیان کرُب کس سرعت اور تگ روی کے ساتھ چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اور کس طرح اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں کہ ایک پل کے لیے بھی قرار نہیں لیتے۔ پھر ان کرات کی کثرت اور ان کے ہجوم واژدحام پر نظر پڑی۔ اور دل حیرت زدہ گہرا کے بول اُٹھا کہ ”میدان تخلیق انہیں لاکھوں کروڑوں کروڑوں سے بھرا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک مجاہد خود ایک عالم ہے۔ اور ہم ان سب کی کُنہ حقیقت ان کے حالات و اطوار۔ اور ان کے اغراض و خلیق سے کس قدر ناواقف ہیں“

اپنا عجز اور اپنی بے حقیقتی یاد آتا تھی کہ خیال سب طرف سے پھر پھر کے اور کروڑوں پدمون میل کی مسافت طے کر کے پھر اپنے اُسی کلبہ احزان میں واپس آیا اور اپنی حقیقت دریافت کرنے میں مشغول ہوا۔ مگر ظلم قدرت کے محافظ فرشتوں نے روکا اور ڈانٹ کے کہا ”بس۔ آگے قدم نہ بڑھانا۔ سب سے بڑا ظلم خود تیرا نفس ہے۔ جسے تو ہرگز نہیں سمجھ سکتا“ سیاح خیال اب اس قدر تکی ڈانٹ پر پہنچا۔

اور مشک کے کھڑا ہو گیا۔ گہرا کے بھاگنا چاہتا تھا کہ چھت میں ایک ننھا سا سونچ نظر پڑا جس میں سے شعلہ آفتاب نے اندر آ کے زمین پر دھوپ کی ایک نورانی چٹی بنا دی تھی۔ اُس چٹی سے چھت کے سوراخ تک نور کی ایک روشن سلاخ دکھائی دی جس میں لاکھوں ننھے ننھے ذرے اسی طرح اڑتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے پھرتے تھے جس طرح فضا نے عالم کے زبردست اور عظیم نشان کر کے اڑ رہے ہیں اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ جب ہم بھی دھوپ میں آگئے تو یہ ذرات نظر سے غائب ہو گئے۔ جیسے کہ دن کو اجرام فلکی ہمارے سامنے سے غائب ہوتا ہے۔ اور جب ہم اُس کلمہ احزان کی تیرگی میں جا بیٹھیں تو وہ پھر چمک اُٹھے جیسے کہ رات کو تارے چمک اُٹھتے ہیں۔

ذرات کی اس تیرگی اور اُن کی چمک دمک نے دیر تک مجھ پر رکھا چرس دل نے کہا ”کیا عجب کہ ذرات ارضی کے اس عالم اصغر سے کرات سماوی کے عالم اکبر کا کچھ انکشاف ہو سکے۔“ اور فلسفیانہ غور و خوض کے لیے سر جھکانے کو کہتا کہ ”گہان اضمین ناچتے اور چمکتے ہوئے ذرّوں میں سے ایک نے آواز دی“ تو اور ہماری حقیقت پاسکے! انسان کی عقل ناقص اور یہ دعویٰ! یہ بے دست و پا لی اور اُس کے ساتھ یہ مجنونانہ حوصلہ! جب اپنا کام کر! اور قدرت نے جس کام میں لگا دیا ہے اُسی میں لگا رہ! تو اس لیے بنیں پیدا ہوا ہے کہ ہمارے حرکات و سکنات کا تماشا دیکھے۔ یا ہماری حقیقت معلوم کرے۔ اس بازی گاہ قدرت کا تماشا دیکھنے والا کوئی اور ہی ہے۔ ہم اور تو سب ایک ہیں۔ اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں نے اُسے گویا پا کے التجا کی کہ ”اپنا کچھ حال تو بیان کر“ برا فردختہ ہو کے بولا۔ ”اپنا فرض منصبی ادا کرنے والوں کو داستان گوئی کی فرصت نہیں۔ یہ بلے فکری و غفلت انسان ہی کو مبارک رہے۔ عالم تخلیق کے ہر ہر ذرّے سے سبق لے کہ منشاء قدرت اور اغراض خلیق پورے کرنے میں کس نحوشی کے ساتھ مصروف ہے۔ جسے دیکھے گا اس حالت میں پائے گا کہ خاموش ہے اور اپنا کام کر رہا ہے۔ اگر سب کے خلاف ایک تو ہے کہ اپنے کام سے غافل ہے اور فضول بک بک کر رہا ہے میں نے پوچھا ”اچھا یہی بتا کہ تو کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے؟“

اس کا اُس نے لاپرواہی سے یہ جواب دیا کہ وہ بیان کام کی دُھن میں کبھی اوجھ تو یہ ہی بین میں کیا کرنا ہے۔ اور کیا کر رہے ہیں؟ کدھر جانا ہے اور کہاں جا کے دم میں گے۔ جس کام میں اُس مطلق مطلق نے لگا دیا ہے لگے ہوئے ہیں۔ جہاں نے جائے گا جائیں گے۔ اور جہاں پہونچائے گا پہونچ جائیں گے۔ ہم تو اپنے مالک کے بے غُدر و بے زبان خدمتگار ہیں۔ تیری طرح ہمیں چنان چہین۔ اور کیوں اور کس واسطے نہیں آتی؟

تب میں نے لاجواب ہو کے عاجزی سے کہا ”اچھا اپنی آئندہ حالت اور اپنے اغراض اور ارادے میں بتاتا تو خدا کے لیے کچھ گذشتہ سرگزشت ہی بتاؤ۔ متناک مزاجی سے بولا ”یہ بھی کسے یاد ہے؟ کبھی فرصت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اپنی زندگی کے سگھے کارناموں پر غور کرتا۔ نہ یہاں کوئی دستر ہے نہ کوئی تاریخ۔ لیکن خیر تو خدا کا واسطہ دلاتا ہے تو جو کچھ یاد آتا ہے بتائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے اُس نے اپنی سرگزشت سنانا شروع کی۔ اور بولا :-

”میں جب صفحہ دنیا جو انی زندگی سے خالی تھا۔ اور صرف عالم عناصر کے باہی تصرفات نظر آتے تھے اُن دنوں آج ہی کل کی طرح میں ایک ذرہ بخاک کی وضع سے ہوا میں اُڑتا۔ اور عرصہ ہستی کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ قدرت نے آخر ایک پہاڑ پر پہونچایا۔ جہاں میں چند وزمین ایک بڑی بھاری جہان کے جسم تجزی میں مشاغل ہو گیا۔ اُس پر کارکنان قدرت نے ایک درخت اگایا جسکی قوت نامہ نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور اب میں ایک جسم نباتی کا جز تھا۔ لیکن تغیرات نے کسی ایک حالت پر ٹھہرنے نہ دیا۔ کبھی جھل میں آگ لگتی۔ اور میں زبائے آتش بن کے چلکا۔ کبھی سیلاب آتا اور میں پانی کی موجوں کے ساتھ بہتا۔ کبھی بادِ سموم چلتی اور میں ریگ روان کے ساتھ دوڑتا پھرتا۔“

”اب جو انی زندگی کی تحسلیق ہوئی۔ میں نے نئی عیب صورتیں دیکھیں اور بھڑک بھڑک کے ہوا میں اُڑا۔ مگر متاع قدرت نے پکڑ کے خلقت کے اس سنے کارخانے میں مجھے بھی لگا دیا۔ چنانچہ میرا گزر جو انی اجسام میں ہوا۔ اب میں وحوش کی دشت ناک صورتوں میں نمایاں ہو کر رہتا تھا۔ کبھی مارتا تھا۔

اور کبھی مارا جاتا تھا۔ کبھی شیر تیرن کے مویشیوں پر چھینتا تھا۔ اور کبھی میٹھی بن کے اپنے زبردست حریف سے بھانگتا تھا۔ کبھی ارژد ہابن کے زمین پر ریشکتا تھا۔ اور کبھی طائر بن کے ہوا میں اڑتا تھا۔ بازی گاہ قدرت کا یہ دوسرا کھیل ختم نہیں ہوا تھا کہ خدا نے انسان کی بنیاد ڈالی۔ اس دلہنپ قصہ میں سے صرف اس قدر سمجھے یاد ہے کہ پہلے پہل جب فرشتے عزراہیل کو اٹلے کے آسمان کی طرف اڑے ہیں تو ان کے اڑنے کی ہوا سے ایک دھستکی ٹھنڈیاں مل گئی تھیں اور انھیں ٹھنڈیوں میں سے ایک کی ٹھنڈی میں ان دونوں میں تھا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت آدم جنت سے پھینکے گئے اور زمین پر آئے گئے ہیں تو ان کے گرنے سے جو خاک اڑی تھی اُس کے ذرات میں بھی یہ خاک سا رمبہ موجود تھا۔ کئی بار میں اُس آگ میں چنگاری بن کے چمکا جس پر جناب حوئے رویان پکائی تھیں۔ اور کئی مرتبہ اُن کیہوون میں خشریک تھا جن کے آنے سے رویان نکلتی۔

یوں مختلف وضعوں میں رہنے کے بعد میں اُس خون میں شریک تھا جو قابیل کی گنگاری کے وقت ہابیل کے جسم سے بہ کے زمین پر گر ا۔ کیا کون کہ میں نے کیا کیا رنگ دیکھے ہیں۔ جب آدمی گھونٹوں اور پتھروں سے لڑتے تھے تو میں ان کی ٹھنڈیوں میں ہوتا۔ جب وہ ایک دوسرے کی طرف ڈھیلوں اور پتھروں کو پھینک پھینک کے لڑتے تو میں کبھی کبھی اُن کے پھینکے ہوئے ڈھیلوں میں ہوتا۔ جب وہ ڈنڈوں اور موگر یوں سے مجاہد کرتے تو میں کئی بار اُن کی موگر یوں میں شامل تھا۔ اور بعد ازاں جب انھوں نے لوہے کے آلات واسلحہ سے کام لینا شروع کیا تو میں کبھی کسان کے ہل میں تھا۔ اور کبھی سپاہی کے تبر میں۔ کبھی کسی نیزے کا پھل تھا۔ اور کبھی کسی تیر کا پیکان۔

حضرت ادیس نے جس سٹوئی سے پہلے پہل سبیا اُس کی ٹوک میں ہی تھا۔ حضرت نوح نے جس لکڑی سے کشتی بنائی اُس کا ایک ٹرین بھی تھا۔ اب ہاؤنڈ کا ایک جھونکا مجھے اڑا کے سرزمین فارس میں لے آیا۔ جہاں میں جام جمشید کی مٹی میں گوندھا گیا۔ اور وہ جام بنا جس سے جمشید کا نام روشن ہے فریدون کا زمانہ آیا تو میں اُس کے علم اقبال کا ایک پھر پرا بنا۔ اور چند روز بعد خاک میں ملیا۔

پھر کیکاؤس کے اُس کھٹولے میں تھا جس پر بیٹھ کے فوس بال عقابوں کی مدد سے وہ آسمان کی طرح اڑتا تھا۔

اب پھر ہوا اور پانی کی مدد سے میں نے اقصائے عالم کی سیر کی۔ بابل میں ہونچ کے بعل کی صورت میں شامل ہوا۔ اور اُس تھارگھن نار کی کیفیت دیکھا کرتا تھا جس میں کبھی ہزار ہا اسیران ستم پائز بخر چڑھائے اور جلا کے خاک کیے جاتے تھے۔ اور کبھی کوئی پری زسارہ و دشیزہ دیوتا کے نذرانہ کے لیے لاکے جلائی اور اسکی پیاری صورت خاک میں ملائی جاتی تھی۔

اب بادلوں میں مجھے یہاں سے بھی اڑائے گئی۔ اور فنیقیوں کے ایک تاجرانہ قافلہ کا گرد کاروان بن کے میں مصر پہنچا۔ یہاں کبھی فرعون کے نازنینان حرم کا زیور تھا۔ اور کبھی ام اسے مصر کی مچھلیوں میں ہنر ارباغوانی۔ کبھی فرعون کے کمانچ تھا۔ اور کبھی اسکی ڈار بھی میں گندھا ہوا موتی۔ کبھی وہ مقدس پوجاری تھا جو دیوتاؤں کے ساتھ بتی اور گرچھ کی پرستش کرا پا کرتے تھے۔ اور کبھی وہ مقدس و محترم بتی تھا جسکی وہاں کے سب سے بڑے بتخانے میں پرستش کی جاتی تھی۔ اور آخر میں اُس چھوٹی کشتی کا جڑ تھا جس میں بٹھا کے حضرت موسیٰ بہائے گئے تھے۔

چند روز بعد بنی اسرائیل کے قافلہ کے ساتھ میں ارض کنعان میں پہونچا۔ پوتہ سکینہ میں شامل رہ کے خدا پرستی کی شان دیکھی۔ اور حضرت سلیمان کے مقدس ہاتھوں سے بیت المقدس کی برگزیدہ عمارت میں لگا دیا گیا۔ یہاں چند روز قرار و سکون اختیار کر کے آرام سے بیٹھا۔ اور بنی اسرائیل کے تغیرات کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اُن کا عروج دیکھا۔ اُن کی ترقیان دیکھیں۔ اُن کی خوبیاں دیکھیں۔ اور اُن کی ضلالتیں دیکھیں۔ وہ نازک گھڑیاں دیکھیں جب بابل اور اسیربا و الحون کے بیڑی دل اس ارض مقدس کے پامال کرنے کو آتے تھے۔ اور واپس جاتے تھے۔ اور آخر وہ قیامت کی گھڑی بھی دیکھی جب بخت نصر کے ہاتھوں سے بیت المقدس پامال کیا گیا۔ بنی اسرائیل اسیر ہو کے بابل کی طرف چلے۔ اور میں نے بھی گرد کاروان میں شامل ہو کے اُن کے ساتھ ساتھ مشرق کی راہ لی۔

یہاں سے کچھ دنوں کے لیے اڑتا ہوا ایران میں چلا گیا۔ جہاں زرتشت

کے آئین و قوانین دیکھے۔ لکڑی بن کے آتش کدوں میں گیا۔ اور اجسام
انسانی میں نشو و نما پا کے دھون کی سیر کی۔ پھر خاص سائرس کے اسلمہ کا ایک
جزیرہ کے بابل میں واپس آیا۔ اور بعل کے مندر کے ساتھ سائرس شہر اور مذہب
صابی کو بابل کر ڈالا۔ میں یہیں تھا کہ بنی اسرائیل آزاد کیے گئے۔ اور انھیں واپسی
وطن کی اجازت ملی۔ ایک اسرائیلی کے جسم میں قیام کر کے میں نے بھی مغرب کی راہ
لی۔ اور چند روز کی محرابوں دی کے بعد بیت المقدس کے مندر کھنڈروں پر کھڑا
ہو کے رویا۔ اور اس کے از سر نو تعمیر کرنے میں مشغول ہوا۔

یروشلم کے میکمل ربانی کا گل شدہ چراغ پھر روشن کر کے میں خاک میں گلیا۔
اور عربی تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ یونان پہنچا۔ وہاں یونانیوں کے جسم
میں رہ رہ کے انکی بہادران دیکھیں۔ اور ان لوگوں کی عقل آزمایاں دیکھیں کبھی
وینس (زہرہ) کی دریا مورت بن کے بت پرستی کی شان دیکھی۔ کبھی کسی دوشیزہ
کے جسم میں نفوذ کر کے چشیں گویاں کیں۔ اور یونانیوں کے بڑے بڑے عقدے
حل کیے۔ کبھی فلسفی بن کے رموز حکمت بتائے۔ کبھی طبیب بن کے مسخالی کا جلوہ دکھایا۔
کبھی سپاہی بن کے داد شجاعت دی۔ اور کبھی کسی مظلوم کی صورت میں نمایاں ہو
کے اپنی تھیں میں داخل ہوا۔ اور درندوں کے دانتوں اور پنجوں سے نوچا پھاڑا
گیا۔

ہوتے ہوتے سکندر اعظم کا ایک سپاہی تھا۔ اور اس کے جھنڈے کے نیچے
لوتا ہوا ایران کی طرف چلا۔ مگر راستہ ہی میں نذر اجل ہو کے خاک میں مل گیا۔
تقدیر نے یونانی یاری نہ کی تو اس کے لشکر کی گرد بنا ہوا ایران پہنچا۔ یہاں
کے عظیم الشان انقلابات دیکھے۔ بہادر وں کے پاؤں اور گھوڑوں کی ٹاپوں
سے جو گرد اڑنے کے آسمان کی طرف جاتی اس میں میں بھی ہوتا۔ مگر اقبال سکندری
کا ماشا دیکھنے کے شوق میں رات کو پھر اس کے پاس آ جانا۔ آخر دارا کے زخمی
جسم پر جو خاک پڑی ہے اس کے ذرات میں میں بھی تھا۔ اور اس کے بعد نوشاہ
کے جبین ناز پر جو افشان چنی گئی ہے اس میں میں بھی موجود تھا۔ جب دارالسلطنت
عجم میں سکندر کے حکم سے آگ لگائی گئی ہے اسوقت کی عام مصیبتوں اور تباہیوں

کو مین شعلوں اور دھوئیں کے ساتھ اڑاڑ کے دیکھتا تھا۔ اور افسوس کرتا تھا۔ پھر سکندر کے ساتھ مین نے ہندوستان کی راہ لی۔ افغانوں کی مزاحمتیں دیکھیں۔ راجہ پورس کی لڑائی اور پھر اُس کی اطاعت دیکھی۔ اُن یونانی عمارتوں کو دیکھا جو یہاں اُس نے تعمیر کیں۔ اور پانی کی لہروں کے ساتھ بہتا ہوا اُسکے لشکر کے ہمراہ جنوب کی طرف چلا۔ ملتان کا معرکہ کارزار دیکھا جس میں سکندر زخمی اور نیجان ہو گیا تھا جس وقت وہ زمین پر گرا ہے مین اگرچہ ایک ذرہ خاک تھا مگر جوشِ حبست سے ایسا تیاب ہوا کہ اُس کی پیشانی پر گرو کے اُس کا منہ چوم لیا۔ پھر اُس کے ساتھ بابل میں واپس آیا۔ اُس کی لاش کے ہمراہ مغرب کی راہ لی۔ اور اُسی کے ساتھ خاک میں دبا دیا گیا۔

خیمہ سال تھا کہ اب شاید ہمیشہ کے لیے سکون حاصل ہو جائے۔ اور اسی حالت میں خاموش بیٹھا رہوں گا۔ مگر نظامِ قدرت نے فیہ قرار نہ لینے دیا۔ چند روز بعد پھر تودہ ہوا۔ اور قیصر روم کی توار میں ایک آبدار ذرہ جو ہرین کے چمکا۔ اور رومیوں کے ساتھ ساتھ مختلف شکلوں اور جھمن میں نمایاں ہو ہو کے مین نے دُور دُور کی سیر کی۔ بحیرہ روم کے گرد چکر لگایا۔ اور انگلستان میں پہونچا۔ جہاں قسطنطین کی مان لٹکانی زلفت گر گئی کہ خم میں چھپا ہوا گالیا (فرانس) میں آئے اُس کے شوہر سے ہم آغوش ہوا۔ پھر قسطنطین اعظم کی پہلی صلیب کا ایک جوہرین کے نمودار ہوا۔ اور رومیوں کے ستارے ہوئے پریشان حال سیحیوں کو اپنی طرف کھینچ کے روم پر حملہ آور ہوا۔ رومۃ الکبریٰ کو فتح کر کے قسطنطنیہ میں آیا۔ اور سینٹ صوفیہ کی عمارت تعمیر کرائے کے بعد ہننا کے ہمراہ پھر ارض مقدس میں وارد ہوا۔ یہاں بڑے بڑے گرجے اور کنیسی تعمیر ہوتے دیکھے۔ یہود کی پامالی کے ساتھ ارض مقدس کی دوسری تباہی کا ہولناک منظر دیکھا۔ جب کہ بت پرست قیصر روم نے یہود کے تمام گزشتہ تبرکات کو ایک دم بھر مین جلا کے خاک کر دیا تھا۔

چند روز بعد دیکھا تو مسیحیت رومی تاج و تخت کی وارث تھی۔ یہود ہر جگہ سلسلے جاتے تھے۔ اور بھاگ بھاگ کے جان بچاتے تھے۔ اُنھیں کے ایک بھاگنے والے گروہ کی گرد کاروان میں شامل ہو کے مین نے ارض عرب کی راہ لی۔ اور مدینہ شریف میں پہونچ کے قرار لیا۔ اب یہاں میں ایک معزز شریفی

شخص کے جسم میں تھا کہ پیغمبر عرب علیہ السلام مکہ سے ہجرت کر کے وہاں آئے۔ اور
میں ان کے عقیدت کیشون میں شامل ہو گیا۔ یہاں میں ایک محترم انصاری کی فوری
پیشانی پر سجدہ کا نشان بن کے چمکا۔ اور چند ہی روز بعد عربوں کے اقبال کے ساتھ
ساتھ مالک ارض کی سیر کرنے لگا۔ کبھی عبا سیدوں کی دستار میں تھا۔ اور کبھی سیدوں
کے علم میں۔

۴ خراباہر کی فوج کے ایک سردار کی تلوار میں جگہ پا کے ہندوستان آیا۔ جہاں
کبھی امیروں کا خلعت بن کے نمایاں ہوا۔ اور کبھی فقیروں کا کشتکول۔ کبھی سپاہی
کی تلوار تھا۔ اور کبھی کسی شیخ طریقت کا ظفر تکیہ۔ غرض ایسے ایسے عظیم الشان معاملات
کو دیکھ کے۔ اور ایسی ایسی معرکہ آرائیوں کی سیر کر کے دنیاوی جھگڑوں سے
آزاد ہوا۔ اب پھر وہی پہلا ذرہ خاک ہوں۔ اور تیرے اس کلبہ احزان کی فضا میں
گشت لگا رہا ہوں۔

یہ واقعات سن کے میں نے کہا ”اے مقدس و محترم ذرہ خاک۔ تو تو
عجب مبارک چیز نکلا۔ میری نظر میں تو تجھے ان عظیم الشان کرات فلکی سے بھی
زیادہ وقعت و عظمت حاصل ہے۔ آج تجھے اپنے پاس رکھوں۔ اور تیری سدر
کروں۔“

بولایا تم مجھے میری سیر سے نہیں روک سکتے۔ اور نہ مجھے اسکی فرصت ہے۔
اتنے دلچسپ تماشے دیکھ میں اور خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھوں گا۔ یہ نہ سمجھ کہ میں
خود اپنے شوق اور اپنی مرضی سے لیکن جاتا یا کچھ کرتا ہوں۔ میری باگ اس
خلاق عالم کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر جدھر لے جاتا ہے جاتا ہوں۔ جہاں بٹھا
دیتا ہے پیچھ جاتا ہوں۔ اور جس کام میں لگا دیتا ہے لگ جاتا ہوں۔“

میں نے تیری پاک نفسی میں شک نہیں۔ لیکن اب ذرا غم۔ ہندوستان تیری پوری
قدیمین کر سکتا۔ مگر میں تجھے انگلستان کے برٹش یونیورسٹیز میں بھجوا دوں گا۔
جہاں تو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ اگلی دنیا تجھے دیوتا یا دیوی بنا کے
پوجتی۔ اب تو ان دنوں کی طرح پوجا تو نہ جائے گا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ
دیوتاؤں سے بھی زیادہ تیری عزت کی جائے گی۔ لوگ تجھے سب چیزوں سے زیادہ

عزت و ادب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور شاید پھر کبھی تجھے اُس عالیشان عمارت سے قدم باہر نکالنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔

یہ سنتے ہی بکڑ کے بولا کہ اس چند روزہ عروج دینوی پر مغرور نہ ہو۔ کس کی رہی؟ اور کس کی رہ جائے گی؟ میں کاہل نہیں۔ اور نہ مجھے فرعون اور کلہو شیا کی لاشوں کے درمیان میں لیٹ کے سونے کا شوق ہے۔ میں شہر نے یا قہر لینے کے لیے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ جب تک اجرام فلکی اپنے اپنے چتر کے گرد چکر لگاتے رہیں گے اُس وقت تک فضا سے ہستی میری جو لالچا رہے گی۔ بس جا اب اپنا کام کر۔ کیوں نصیحت اوقات کر رہا ہے؟ اور مجھے بھی جانے دے۔

یہ سنتے ہی میں نے ہاتھ بڑھا کے ارادہ کیا کہ اُسے پکڑ لوں۔ مگر ہاتھ کی حرکت جیسے جیوا پیدا ہوئی اُس کے لیے کافی تھی۔ اُٹا۔ اور دھوپ کی نورانی سلاخ سے علانیہ ہو کے نظر سے غائب ہو گیا۔

نمبر ۷

کیا کہیں کہ سائنس کی موجودہ ترقیوں سے اور ہماری واقفیت کے غیر معمولی درجہ تک بڑھ جانے کے باعث ہمارے کیسے کیسے مزے بکڑے ہو گئے ہیں؟ اور کی چیزوں میں ہمیں جو مزہ پہلے ملتا تھا اب نہیں ملتا۔ یہی سبب ہے کہ کسی پیاری صورت کو دُور سے دیکھنے۔ ماحصلہ ہی پر سے گھوڑ گھوڑ کر رہ جانے۔ اور فراق ہی میں زندگی کاٹ دینے میں جو مزہ ہے پاس جانے میں نہیں۔ اُدھے پہاڑ۔ آبادیوں کے دُور کے منظر۔ اُسی دم تک خوشنما اور سچے معلوم ہوتے ہیں جب تک ہم اُن کے قریب نہیں پہنچتے۔ قریب جاتے ہی خوبیوں کے غلاف میں سے مکمل مکمل کے وحشت ناک نشیب و فراز۔ اور بد نما چٹانیں اور جنگل نظر کے سامنے ہو جاتے ہیں۔ اور سارا شوق خاک میں مل جاتا ہے۔ اُن قدر فی مناظر کو جانے دیکھیے۔ خور مثال ناز آفرین جن کے ایک تیر نظر سے ہم مرتے اور ایک ٹھوکر سے جی اُٹھتے ہیں اُن کی مہوشی اور مہینیتی بھی اُسی وقت تک ہے جب تک دور ہیں۔ اور صوف

اپنے غرنہ سے زرخ زریا کی جھلک دکھا کے ہمیں لبجالی کرتے ہیں۔ ہماری آرزوں اور ہوسوں کے مطابق اگر قسمت مسعدت کرے۔ اور پاس جا کے بیٹھنے اور اُن کے سُرخ زریا کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل جائے تو پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کے یہی کہنا پڑتا ہے کہ بے عیب خدا ہی کی ذات ہے، کیونکہ پاس سے دیکھتے ہی نمایاں طور پر نظر آ جاتا ہے کہ حُسن کے آجمل کے نیچے بہت سے عیوب ہیں پھول کے ساتھ کاٹھے ہیں۔ نرگس شہم بیمار ہے۔ چاند کی سی حسین ناز میں کلفت ہے۔ اور آتشیں سُرخ کی آب و تاب میں خال کا دھواں ہے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں نظر آ جاتا ہے کہ محاسن کے ساتھ صد ہا معائب ہیں۔ اسی بنیاد پر سچے قدردانان حُسن نے ہجر و فراق میں جان دے دینا گوارا کیا۔ اور دولت وصل ملی بھی تو نہ قبول کی۔ اور اسی سبب حقیقت شناس ہمزدانان قدرت یعنی اہل دل و دلیو نے بتا دیا کہ دھال کے ساتھ ہی عشق کا خاتمہ ہو جاتا ہے

یہی کیفیت ان روشن اور جگمگاتے اجرام فلکی کی ہے۔ دور سے ہمیں کیسے جملے معلوم ہوتے ہیں؟ ہمیں مین ہم انھیں کیسے خوش ہو ہو کے دیکھا کرتے تھے؟ ہمارا ہمیں بھی جانے دیجیے۔ دنیا نے اپنے زمانہ طفولیت میں ان سے کیسے کیسے لطف اٹھائے ہیں۔ اور ان کو دیکھ دیکھ کے کیا کیا خیال آفرینیاں کی ہیں۔ انھیں کی نورانی محفل کو سر و شہستان اور انبی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز و مرجع قرار دیا۔ کبھی کبھی ان کو دیویوں اور دیوتاؤں کا نشیمن و مسکن اور کبھی خود دیوی دیوتا قرار دے دیا۔ ان کی پیاری اور دلنفریب تصویریں مصوخیال نے کھینچ کے دکھائیں اور ایسی تصویریں دکھائیں کہ مو شان ارض کو بھول کے انھیں کے دلدادہ ہو گئے۔ وہ کیا اچھا اور کیسا معر کا زمانہ تھا؟ اور ہم آسمان کی طرف کبھی نظر اٹھا دیتے تو کیسا لطف آ جاتا تھا؟ یا ایک آج کا زمانہ ہے کہ سائنس کی ترقیوں اور دوربینوں کی ایجا د نے عالم کا نقشہ ہی اور کر دیا۔ اور ہم جینا ہی فلک کا سارا حُسن و جمال خاک میں مل کے رہ گیا۔

اسی زہرہ (سپارے) کو لیجیے۔ اس کی جو دلربا تصویر ہمارے مصوخیال نے اپنی چابکدستی سے کھینچی تھی ایسی نہ تھی کہ ہم اُسکی طرف دیکھیں اور دیکھ چکیں۔ یہی ایک ایسی نازنین صورت تھی جس پر ہمیں ناز تھا کہ اُس نے عالم علوی والوں

کا زہر و تقویٰ خاک میں ملا دیا۔ اور فرشتہ بھی اپنی معصومیت سے دست بردار ہو کے اُسکی زلف گر گیر میں اسیر ہو گئے۔ اس قصہ کو ہم کس فخر و تکنت اور کیسے غرور ناز کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے کہ ہاروت و ماروت نام فرشتہ خدا کے پاس سے دنیا کے انتظام کا بیڑا اٹھا کے آئے۔ یہاں آتے ہی پری دوش زہرہ و مشتری کی صورت دیکھی تو ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ اور جوش عشق میں اپنے تقدس اور اپنی ذمہ داریوں کو بھول کے دین و دنیا سے ایسے غافل ہوئے کہ سوا شاہد پرستی کے کسی بات سے سروکار نہ رہا۔ آخر نشہ عشق سے بخود ہو کے ان دونوں مہم جینیوں کو آسمان پر لے گئے۔ جہاں پہنچتے ہی ہاروت و ماروت پر تو عتاب ہوا۔ اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے بابل کے مشہور گر بے نشان کنوئین میں لٹکا دیے گئے۔ مگر وہ دونوں سزا پائنا ز اور ملائک فریب خورشیدین بزم انجم والوں کو ایسی بھلی معلوم ہوئیں کہ وہیں روک کے آفتاب و مہتاب کے پہلو میں بٹھادی گئیں۔ جہاں سے قیامت تک اپنے بناؤ سنگھارا اور اپنے حسن عالم سوز کے کہنہ دکھا دکھا کے عالم بالا والوں کو محفوظ کرتی اور دنیا کے دلدادہ جن پرستوں کو بھلا رہیں گی۔

یہ کس قدر مزہ دار اور دلچسپ قصہ تھا۔ اور اُس کے بیان میں کیسے کیسے لطف تھے مگر افسوس کہ ان سب مزوں اور لطفوں کو موجودہ سائنس نے خاک میں ملا دیا۔ ہم تو ان ہیئت والوں کی باتوں سے اب بھی انکار کیے جاتے۔ اور کہہ دیتے کہ اتنی دور کی باتیں کوئی کیونکر جان سکتا ہے۔ تمہارے سب دعوے غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اور تم ہم سے زیادہ خیالی اور بام میں مبتلا ہو لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ درختوں سے دکھا کے اپنے دعووں کا معائنہ بھی کرا دیتے ہیں۔ اور ہم سے سوا اس کے کہ لاجوابی سے خاموش ہو رہیں کہچھین بن پڑتا۔

اسے روشن اور مہجین زہرہ۔ ہم تجھے کیا سمجھے ہوئے تھے اور تو کیا نکلی۔ ہم تو تجھے جملہ عروسی کا ایک شاہد زیبا خیال کرتے تھے۔ مگر غور سے دیکھا تو یہ ثابت ہوا کہ قدرت کے فٹ بال فیلڈ فٹ بال کا میدان، میں تو ایک عظیم الشان

گیند ہے جسے کارکنان قدرت کو عکاس کر دینا کے اپنی مستعدی اور پستی و چالاک کی بڑھاتے اور ہمیں تماشہ دکھاتے ہیں۔

اب ذرا یہ بھی سن لو کہ آج کل کا سائنس اور زبردست دور زمین کا ترہمہ اس پلٹے پھرتے تارے کی نسبت کیا کہتا ہے جتنی بڑی ہماری زمین ہے تقریباً اتنا ہی بڑا یہ ایک کرہ ہے۔ اتنا ہی ٹھوس اور ثقیل ہے جتنی کہ زمین ہے اس کا اسی جسم تاریک و بے نور ہے مگر آفتاب کے عکس میں چمکتا۔ اور سورج کی کرنوں کا غارہ مل لینے سے اپنی کالی صورت کو ہمیں گورا اور روشن رخ زیبانا کے دکھاتا ہے۔ اور چونکہ بمقابل اور سیاروں کے ہم سے قریب تر ہے اس لیے سب سے بڑا اور روشن نظر آتا ہے تاہم اس کے چہرے میں کھٹ اور سیاہ داغ ہیں۔ مگر ابھی تک یہ پتہ نہیں لگا کہ اس میں سمندر اور پہاڑ ہیں یا نہیں۔ اور اُسکی کیا حالت ہے۔ آفتاب کے طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد ہمیں نظر آتا ہے۔ اور زیادہ روشنی کے نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ آفتاب کے گرد جو سیارہ سب سے پہلے اور اُس کے قریب تر چکر لگا رہا ہے وہ عطارد ہے۔ اس کے بعد ہی زہرہ ہے۔ اور اس کے بعد زمین۔ لہذا زہرہ ہمارے اور آفتاب کے درمیان میں حرکت کر رہا ہے۔ اس کا دورہ ہماری زمین کے میدانِ گلشت سے چھوٹا ہے۔ زمین ۲۴ گھنٹہ میں گھوم جاتی ہے تو زہرہ ۲۲۔۵ ہی گھنٹہ میں۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ زہرہ کا دن رات ہم سے ایک گھنٹہ کم یعنی ۲۳۔۵ گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ زمین آفتاب کے گرد ۳۶۵ دن میں چکر لگاتی ہے تو زہرہ ۲۲۴ دن میں۔ لہذا سمجھنا چاہیے کہ اس کا برس ہمارے حساب سے فقط ساڑھے سات مہینے کا ہوتا ہے۔ زمین اپنی رفتار میں ایک طرف کو کسی قدر جھکی ہوئی چلتی ہے جس کی وجہ سے دن رات چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ اور موسموں کا تغیر و تبدل ہوتا ہے زہرہ اپنی چال میں زمین سے تقریباً دو ناچھکا رہتا ہے۔ اس لیے اس کے دن زمین کی بہ نسبت بہت زیادہ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے موسموں کا انقلاب بھی بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔ سردی میں سردی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور گرمیوں میں گرمی۔ اس کے گرد اب کبھی ہجوم ہے۔

دیگر شیاردن کے خلاف زہرہ اور عطار دین یہ خاص بات ہے کہ
 ہاتھ اب کی طرح بدر و ہلال بن کے نمایان ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ کہ ہمارے
 اور آفتاب کے درمیان میں ہیں جب آفتاب کے بالکل اُسُطُف ہو جاتے ہیں اور
 ہمارے ان کے درمیان میں آفتاب ہوتا ہے اُس وقت اُن کا پورا چہرہ چمکتا نظر آتا
 ہے۔ اور جب بالکل اُسُطُف آ جاتے ہیں اور آفتاب کے اور ہمارے درمیان میں
 ہوتے ہیں اُس وقت چونکہ اُن کا روشن رُخ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہوتا اسلئے
 نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر اُس کے بعد جو آگے بڑھتے جاتے ہیں تھوڑا
 تھوڑا روشن حصہ نمایان ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے پہلے باریک ہلال ہوتے ہیں اُس
 کے بعد روز بروز بڑھتے رہتے ہیں۔ پھر مکمل کو پہنچ کے بدر بنتے ہیں۔ اور اُس کے
 بعد گھٹنے لگتے ہیں۔

ان کے عروج و زوال میں ایک خاص بات اور بھی ہے جو چاند کے عروج
 و زوال کے بالکل خلاف ہے۔ چاند چونکہ زمین کے گرد چکر لگاتا ہے اس لئے
 وہ ہر زمانے میں ہم سے قریب یکساں فاصلہ پر رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کے ہلال
 کی قوس اتنی ہی بڑی رہتی ہے جتنا کہ اُس کے بدر کا دور ہوتا ہے۔ یعنی اُس کا ہلال
 اُس کے بدر کے دائرہ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ یہ خلاف اس کے زہرہ جب
 بدر ہوتا ہے بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ اور جب ہلال ہوتا ہے تو بہت بڑا یعنی اُس
 کے ہلال کی قوس اُس کے بدر کے چکر سے چھ گونی بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا سبب
 یہ ہے کہ مشتری جب ہلال ہوتا ہے اُس زمانے میں ہمارے اور آفتاب کے درمیان
 میں ہوتا ہے۔ اور زمین سے اُس کا فاصلہ تقریباً دو کروڑ چاس لاکھ میل کی مسافت
 ہوتا ہے۔ لیکن جب آفتاب کے اُس طرف نکل کے وہ بدر کی صورت میں نمایان
 ہوتا ہے اُس وقت اُس کی مسافت ہمارے یہاں سے تقریباً سو لاکھ میل
 ہوتی ہے۔ یعنی شمس گو نہ مسافت سے زیادہ فاصلہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی باعث
 بدر ہونے کے وقت وہ بہ نسبت ہلال ہونے کے چھ حصہ چھوٹا دکھائی دیتے لگتا ہے
 جب وہ آفتاب کے اور ہمارے درمیان میں ہو کے گزرتا ہے تو اکثر قریب
 اندھ سے بچ کے نکل جاتا ہے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چشمہ آفتاب کے

عین محاذی ہو کے گزرتا ہے۔ جس سے سورج گن ہوتا ہے۔ اور ایک دم کے لیے زہرہ سورج کے رُخ تابان کا خال بن جاتا ہے۔ ایسا سورج گن جو زہرہ کے درمیان میں آ جانے سے واقع ہو کم ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کا ایک گن ۱۸۸۶ء میں ہوا تھا۔ اُس کے بعد ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اور اہل ہیئت اپنے حساب سے بتاتے ہیں کہ اب اس کے ایک سو ساڑھے پانچ برس بعد ہوگا۔ یعنی ۱۹۹۶ء میں چھ ہینہ گزر جانے کے بعد۔

ان بیانات کے سن لینے کے بعد وہ پرانی زہرہ جو ہماری خیالی معشوقہ تھی جسے ہم یزم انجم کی ایک دلربا نازنین خیال کیا کرتے تھے۔ اور جسے اپنی خیالی سجاوٹ میں بٹاؤ کے نچالیا کرتے تھے کہاں رہی۔ افسوس یونانیوں کی وہ ناز آفرین دیوی جو حسن و عشق کی دیوی تھی۔ اور جس کے دم سے عاشقی و معشوقی کے عالم میں جان بڑجاتی تھی غائب ہو گئی۔ اور اُس کے عوض ایک گول لڑھکتا ہوا گیند نمودار ہوا جس میں اگر تھوڑی بہت آب و تاب ہے بھی تو کرائے کی اور دوسرے سے مانگی ہوئی۔

شاہدان بازاری میں ایک کھاوت مشہور ہے کہ۔ رات کو شیطان اپنا ہاتھ پیر کے اُن کے چہروں کو خوبصورت بنا دیا کرتا ہے۔ گردن کو اُن کے گردے بنا دیکھتے تو نفرت ہو جاتی ہے۔ یہی حال اسے زہرہ تیرا اور تمام اجرام فلکی کا نکلا۔ اس موقع پر شیطان کا مام لینا تو ہم گستاخی اور بدگینہی خیال کرتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بازیگر قدرت رات کے وقت تم سب سامان والوں کے چہروں کو اپنا ساحرانہ ہاتھ پیر کے چمکا دیا کرتا ہے۔ اور دن کو کچھ ایسی بُری صورت ہو جاتی ہے اور ایسے گردے بنا دیتا ہے کہ مارے شرم کے تم اپنا منہ ہی نہیں دکھاتے۔

تاہم اسے زہرہ تو چاہے ہوا کے تخت پر اُڑنے والی پری ہو یا ایک کثیف جسم کا لڑھکتا ہوا گولا۔ ہم سے حُسن پرستوں کی نگاہ میں تو آج بھی ویسی ہی دلربا نازنین ہیں جیسی کہ پہلے تھی۔ علم ہیئت سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ نجمین شرعاً عرب کے مذاق کے مطابق کسی نیکی ہوتی شنی کی طرح ادھر اُدھر جھک جھک کے چلتا۔ اہل فارس کے مذاق کی مست خرامی۔ اور ہماری خواہش کے موافق اٹھلا اٹھلا کے اور نجوم نجوم کے قدم

اٹھنا ہے۔ تجھ میں شوخ ادا ناز آفرینوں کے یہ کر سنے ہیں کہ کبھی پاس آئے
اپنا ہلال ابرو چمکا دیا۔ اور کبھی دوتہ کھڑے ہوئے ہنسا رخ روشن دکھا دیا۔ کبھی دیکھتے
ہی دیکھتے نگاہ سے غائب۔ اور کبھی آفتاب کے رخسار و نشان کا بل نگاہ شوق ڈھونڈتے
پھرتی ہے اور ٹوکسی شوخ ادا کی طرح اُس سے چھلی چھلیا کھیل رہی ہے۔ کبھی یہاں ہے
اور کبھی وہاں۔ ابھی یہاں تھی ابھی وہاں جا پہنچی۔ ابھی پورا چہرہ سامنے تھا۔ اور
ابھی کچھ لٹھا ہے اور کچھ گھٹ گھٹ میں۔ اور ٹھوڑی دیر کے بعد جو نظر اٹھا کے دیکھتے
ہیں تو غائب! اگلے جو کہتے تھے کہ تو اندر اور دوسرے دیوتاؤں کی محفل میں
ناچتی ہے تو یہ غلط نہ تھا۔ تو آج ہی ناچ رہی ہے اور ساری دنیا والوں کے
سامنے۔ اور پھر ایسے ناز و انداز سے۔ یوں اٹھا اٹھا کے۔ اور یوں رخ زیبیا
کو کبھی گھونگھٹ میں چھپا کے کبھی نیم ڈاکر کے۔ اور کبھی خوب نمایاں کر کے کہ تیرا ناچ
دیکھنے والوں کو تمام سینماں جہاں کے ناچ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور ہر تیری
تیری مستانہ چال ہی پر نظر جائے رہتے ہیں۔

اگلی دلچسپیاں

کچھ ایسی نہ تھیں اگلی دلچسپیاں	جنہیں بھول جائے کوئی مہربان
بتاؤ تو اسے اختراں فلک	ان آنکھوں سے دیکھا ہو کیا کہان
تھاری تو صورت کے دیتی ہے	کہ سب کچھ ڈالا ہے تم نے جہاں
جھپکتی نہیں ایک پل بھی پلک	رہا کرتے ہو رونق آسمان
خصوصاً وہ حسرت بھری رات ہے	ق کہ جب اپنے اس دور کے درمیان
تھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تکیے	گزر جاتی ہے شب پرانے نشان
سحر کو چھپ جاتی ہیں پاس سے	تھاری وہ آنسو بھری آنکھیاں
عجب لطف کی ہے نیم سحر	قیامت کی ہیں اُسکی آنکھیلیاں
مگر جب وہ افسردہ دل کی طرح	چلی ڈھونڈنے اگلی سرسبزیاں
تو اُڑے ہوئے پائے ایسے چمن	کہ جو رونق دہر تھے بیگمان

وہ اگلے موج جو طے کر سکتے تھے
قیامت کا ہوتا ہے انہیں انڑ
وہ عالی منش بادشاہان دہر
وہ طلبا کہ دن رات محنت سے جو
مبارک تعین شایستہ وہ محفلین
وہ نکھری ہوئی صحبتیں کامیاب
وہ علم اتھی کے اجلاس پاک
وہ اگلے پیادہ روی کے سفر
سمندر والو اعز میوں سے تھے پُر
جہازوں کے وہ نامور ناخدا
وہ بڑے مقدس وقائع نگار
جب اقبال کی چل رہی تھی ہوا
سنور تھی تہذیب کی انجمن
نہ تھی قحط سالی نہ طاعون تھا
زبان سے جو کہیں نہ کر کے لکھائیں
کہاں تک کہ جائیے یہ کتھا
یہ نقش طلسمی زمانہ نے سب
نہ وہ اگلی باتیں نہ وہ اگلے لوگ
بس انجہاب غفلت سے بیدار ہوں

ترقی میں نہ کرسی آسمان
سناتی ہے جو حال انکی زبان
وہ انکی سواری وہ تخت روان
لگاتے ہیں امید کی سیڑیاں
مبارک تھی وہ بزم اسپیکران
جو وحدت پرستی کی تعین زبان
مجالس مدارس کے وہ قدر دان
وہ فائقے کی سوکھی ہوئی روٹیاں
انہیں ہمتوں سے تھے دیار دان
وہ اہرام مصر کی صنایع ان
وہ سچ بولنے والے پیر جوان
جب اوبار کا تھانہ نام و نشان
شجاعت دکھاتی تھی بوستیاں
بہشت برین تھا یہ ہندوستان
نہ افسوس دولت نہ افسوس جان
مڑے کی ہے حسرت بھری داستان
مثالے مٹا کر کیے رائیگان
مگر ان کی باقی ہیں دلچسپیاں
جو موجود ہیں قوم میں نوجوان

کرین ایسی کوشش کرین ایسے کام
زمانہ پس مرگ ہو قدردان

راقم خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

✓ آج

دوسرے پرمیوٹس قیامت کی پوزنگ اور بارہے اسی کڑھل ہر طرح

”جی ہاں آج ہی! جو کچھ ہونا ہے آج ہی ہو جائے گا۔ انسان بڑا جلد باز ہے۔“
 ”نظریہ انسان کا جو کچھ آج کے فیور میں پڑی ہوئی ہے۔ جانتے ہیں کہ جلدی
 کا مہیشطان کیا ہے؟“ ”جہاں جلدی پاتا ہو کر پھرتا ہے وہاں شیطانی مہین۔ ٹھوکر
 پر ٹھوکر کھائیں۔ مگر پڑیں۔ ہاتھ منہ لوث جائے۔ سب گوارا ہے۔ اور یہ مہین گوارا کہ
 غرض پھیل ہوئے۔ اور آواز پوری ہونے میں ایک دن کی ریر لگے۔ اور پھر لطف یہ
 کہ آپ کا بل بھی اول درجہ کے ہیں۔ حصول مقصد کے پوتا میرٹھین ان کے بجالانے میں قبل
 درجے کے کاہل۔ اور مطلب نکالنے میں پرے سے سرے کے جلد باز۔ لوگ کہتے
 ہیں کہ جو چیسہ میں ایک دوسرے کی غم میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ مگر ہیکل انسانی
 ایک ایسے سر آفرین مدار میں کا تھا ہے۔ کہ اس میں یہ اور اس طرح کے صدا کا کرشنے کی جیسے
 درباؤن کا عہدہ فرما مشہور ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ آج کل ان
 عہدہ داروں کا کسی نے اعتبار نہیں کیا۔ مگر یہ بے اعتباری کیوں؟ ہزاروں ناز
 آفرینوں نے سچے دھڑے بھی کیے۔ بہتوں نے اپنے دھڑے پورے کیے۔
 اور منتظر آنکھوں کو ٹھیک وقت موعودہ پر پابندی چاند سی صورت دکھا دی۔ مگر وجود
 اس کے پری جالوں کا عہدہ ہمیشہ عہدہ قیامت خیال کیا گیا۔ اور عورتوں

کی کل فردا سے حشر ہی سمجھی گئی۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ انسان وعسے ہی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ کل نہیں آج ہی۔ آرزو میں بر آنے والی ہے تو آج ہی بر آئے۔ کل بر آئی تو کیا۔

طالب علم بالبع تعلیم سے متنفر ہیں۔ اور پڑھنے سے بھاگتے ہیں۔ نہ جو رہا استاد و گوارا ہو سکتا ہے۔ نہ سبق یاد کرنے اور نہ سٹنٹ کی محنت برداشت کی کجالی ہے۔ صرف اس لیے کہ تعلیم آئینہ کا مینا بیون اور ترقی و ن کا ایک وعدہ اور وہی معشوقہ ناز آفرین کی کل ہے۔ آج کچھ پڑھ لو کل ہر جگہ قدر کی جائے گی۔ اور زمانہ اپنی آنکھوں پر بٹھالے گا، مگر کم بخت دل اس وعسے پر تناعت نہیں کرتا۔ بار بار اصرار ہے کہ چھوڑو بھی اس محنت و جفا کشی کو۔ لوگوں سے درخواست کرو کہ آج ہی قدر کرنے لگیں۔ اور زمانے سے کہو کہ آج ہی آنکھوں پر بٹھالے۔

مذہب نے جن عبادتوں جس زہد و تقویٰ۔ اور جس قسم کے اخلاق و عادات کی ہدایت کی ہے جانتے ہیں کہ اُن پر کار بند ہونے میں دین کا بھی نفع ہے۔ اور دنیا کا بھی۔ مگر کم بخت جی ایک وحشی جانور کی طرح رستیان توڑا رہا ہے۔ بھاگتا ہے اور کرتا ہے کیسے ملا؟ اور کیا ان کے واعظ و عذاب الہی اگر مرنے کے بعد ہونے والا ہے تو ہو۔ باغ جنت ہر قسم کی لذتوں کا معدن ہے تو ہو اگر سے۔ اور حوروں کی چین تابان چاند سے زیادہ چمکتی ہے تو ہو کا کر سے۔ ہمیں تو یہ سب لذتیں آج ہی ملنی چاہیے۔ کل ملین تو کیا؟ جنت میں اگر مزہ ہے تو ہمیں کل نطفہ نہیں آنے کا۔ اور حوروں کی ہلکاری اگر کل ہونے والی ہے تو ہم نہیں چاہتے۔ خلاصہ یہ کہ مذہب کے یہ سچے وعدے بھی اگر کسی اور دن پر اٹھا رکھے گئے ہیں تو ہم اُن سے بھی دست بردار ہونے کو موجود ہیں۔

دنیا کی تاریخ بتا رہی ہے کہ قوموں کا عروج اور ان کا مٹنا ایک دن میں نہیں ہوتا۔ بنتے بنتے بنتی ہیں اور صدوں کی محنت و مشقت کے بعد بنتی ہیں۔ مگر اس جمہوری و مجموعی ترقی میں بھی چونکہ کسی حور و ش کے وعسے کی شان نظر آتی ہے اور کل کا وعدہ کیا گیا ہے لہذا اس میں بھی صبر نہیں ہو سکتا۔ محنت کرنے والے اگرچہ جبریت مشقت کو رہے ہیں مگر اکتائے جاتے ہیں۔ اور بھیری کا تقاضا ہے۔

کہ اگر آج ترقی نہیں چل رہی ہوئی - اور ترقی یافتہ قوموں کی سی برکتیں نہیں ہاتھ آئیں تو اس بغاوتی محنت سے سبکدوش ہو جانا چاہیے - اس کیفیت کا نمونہ ہندوستان سے زیادہ کس ملک کی حالت ہو سکتی ہے ؟ اپنا سے وطن نے ذرا ذرا آنکھ کھولی ہے - اور وہ ان کا آگے بڑھ جانا دیکھا ہے - اور اپنی پس ماندگی نظر آئی ہے لیکن اس ناتوان بچہ کی طرح جسکے پاؤں میں ابھی طاقت نہیں اور چاہتا ہے کہ اس کھلونے کو دوڑ سکے اٹھائے تاکہ بازو کی طرح اڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور بجائے حکم لے کر چلتے ہیں۔

انسان کی اصلی تعلیم یہ ہے کہ اس کے اس عجالت اور جلد بازی کے جوش میں اعتدال پیدا کیا جائے - یہی تعلیم مذہب دے رہا ہے کہ ”من طلب وجد“ مگر سب ان کا ہلی کے ہجوم نے تقدیر کے مسلہ کو سچی و کوشش سے وابستہ کر کے نیا اور عجیب و غریب دے رکھا ہے - جس کی وجہ سے عظیمین دین بجائے اس کے کہ ترقی و اول العزمی کا سبق دیں - کاہلی اور پست ہمتی کے موید ہو گئے ہیں - حالانکہ ساری کائنات اور دنیا کا ہر ذرہ زبان حال سے پکار رہا ہے کہ رہا ہے کہ جلد بازی اور پیش قدمی کرو - مگر سچی و کوشش میں - نہ یہ کہ بغیر محنت کے اور بے اس کے کہ ذرائع و تدابیر کا دامن بڑا دشا بد آرزو کے زبردستی پکڑنے اور آغوش شوق میں کھینچ لینے کی کوشش کرو -

ہم تم

اہل ذوق صوفی صافی کہتے ہیں کہ ”وہ“ اور ”صہف وہ“ اور ہم کہتے ہیں کہ ”ہم تم“ اور نقطہ ہم تم - بس جو کچھ میں ہی تم ہیں - اور باقی کچھ نہیں - تم ناز آفرینی کے لیے ہو اور ہم ناز برداری کے لیے - تم ہمارا دل بھلانے کے لیے ہو اور ہم عالم ہستی پر قبضہ کرنے کے لیے - تم گل خوش رنگ ہو اور ہم اس سے لطف اٹھانے والے - تم صبح گمش کے طائر خوش الحان ہو - اور ہم اس کا نغمہ دلکش سننے والے - تم آفتاب جہان تاب ہو - اور ہم ستارہ پرست - تم بُت ہو - اور ہم بھرت

اور دھرجاتے ہیں اور دھرج کر لگاتے ہیں۔ غرض سب کچھ کہہ گئے مگر یہ نہ بنایا کہ یہ کیوں پھرتے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں۔ اور ان کی اس دوڑ و عوپ کی اصلی غرض کیا ہے؟ اگر وہ نہیں بتاتے تو لوہم سے منو۔ یہ سب تمھاری تلاش اور تمھارے شوق میں سرگرداں ہیں۔ تمھاری دھن میں لگے ہوئے ہیں اور گوہم نہیں سنتے مگر اپنی زبان حال سے قدم قدم پر پکا رتے جاتے ہیں "تم" "تم"۔ تمھارے ناز معشوقانہ اور تمھاری کرشمہ سازیاں یہ عجب تماشا دکھا رہیں ہیں کہ سب کو اپنی طرف کھینچتے ہو۔ اپنے پاس بلا لیتے ہو۔ اپنا سرگرداں کرتے ہو۔ اپنی تمنع جمال کا پروانہ بناتے ہو۔ مگر اپنے قریب نہیں آسکے دیتے۔ شوق وصل کی بیابیوں نے عالم نکوین میں پلجیل ڈال رکھی ہے۔ ذرہ ذرے سے بکراتا کرہ کرہ سے لڑتا۔ اور ایک دوسرے کو مٹاتا اور کھائے جاتا۔ مگر تم متا و خوشی کے ساتھ بیٹھے تماشا دیکھتے ہو اور ترس نہیں کھاتے۔

مگر ہم اس بے پروائی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ جب جو شہزادہ غائب ہوتا ہے۔ اور ہم تمہارے سوا سب کو بھول جاتے ہیں اُس وقت ہماری فطرتیں سارا عالم کو بے یار۔ یا تمہاری نگلی میں جاتا ہے۔ اور جو شخص محبت سے وہ دین آ آ کے ہم پر نعرہ مستانہ بلند کرنے لگتا ہے کہ ”ہم تم“

✓ عیسیٰ

انسانی زندگی کا تیسرا دور۔ یا سافرون کی تیسری منزل۔ یا نچھانہ عمر کا آخری جام اگرچہ یہ اعتبار دور ثانی یعنی عہد شباب کے کسیدہ رنگوں اور ناگواروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ناتجربہ کار نوجوان اُس کو زندگی کا ایک ناگوار اور بیکار حصہ سمجھتے ہیں بلکہ بعض تو اُس ناقابل لحاظ عمر سے بھی بہتر خیال کرتے ہیں جس کو لوگ عرف عام میں طفلی کہتے ہیں اور جو حقیقت ایک بیہوشی اور نامی کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن تحقیق کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو اُسکی وقعت تمامی ایام زندگی سے بدرجہا بلند ہے۔ اس کا ایک بدیہی ثبوت یہی موجود ہے کہ مذہب

نوجوان پیران کئی سال ہی کے نقش قدم پر پیل کے اپنی زندگی کے باغ کو زمانہ شناسی کے پودہ حوں اور تجربہ کاری کے پھولوں سے آراستہ کرتے۔ اور ضروری و مناسب قطعہ دیر عمل میں لاتے ہیں۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ بڑھاپے کو "پیری و صعب" کا الزام دیا جائے۔

اس عام مقولے کے خلاف ہم تو دیکھتے ہیں کہ زندہ دل دوستوں اور نوجوانوں کی حیرت انگیز صحبتوں اور دلچسپ محفلوں سے ان بوڑھے دیش سال جہان دیدہ سرد و گرم زمانہ چشیدہ بزرگوں کی مقدس صحبتیں ہمارے واسطے بہت کچھ مفید ہیں۔ رہا ذوق و شوق اور جوش و خروش۔ تو اسے بھی ایک زمانہ شناس شاعر نے بوڑھوں ہی میں زیادہ مان لیا۔ کہتا ہے :-

ضعیفی میں جوانی سے زیادہ جوش ہوتا ہے
بوڑھا آدمی اگر مرجاتا ہے تو اس کا استعدافسوس نہیں ہوتا اس سبب

سے کہ وہ اپنی زندگی کے انمول زمانہ کو طے کر چکا تھا اور دنیا میں رہنے کا مزا اٹھا چکا تھا۔ بخلاف اس کے اگر کوئی جوان آدمی مرجاتا ہے تو جو کچھ اُس کے متعلقین کو رنج اور صدمہ ہوتا ہے اُس کی تشریح کوئی اُن کے دل سے پوچھے جو اُسکی لاش پر کھڑے قائم کر رہے ہیں۔ اُن کی گریہ و زاری کا خاص سبب یہ ہے کہ جو زمانہ زندگی کے عمدہ مدارج کا تھا اُس سے یہ محروم رہا۔ دنیا سے ناشاد اوڑنا مراد جانا اور زندگی کے باغ کی بہار نہ دیکھنا اسی کا نام ہے کہ پیری کے مبارک عہد سے فیضیاب نہ ہوا یہ ماننا کہ جوانوں میں ہمت ہوتی ہے مگر بوڑھوں کی سی تدبیر کمان سے لائیں گے؟ تجربہ نے بوڑھے اُنھوں پر ایک دُور بین لگا دی ہے جو احوال مستقبل کی ہو بہو تصویر پیش نظر کر دیتی ہے۔ قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قانون قدرت نے بھی شباب پر شیب کو فضیلت دی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ اُس وقت خلعت نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اور وحی نازل ہوئی جب زمانہ شباب رخصت ہو چکا تھا اور شیب کا دور دورہ تھا۔

جوانی کی سیہ کاریاں صحبت ہائے عیش کی شہانہ بندیاں۔ شاعرانہ جوش

زندہ مشربی کے مزے - کسی جھاکا رکی شمشیر تغافل کی شکایت - ہجر کی بستیابی
اور بقراریاں - وٹل کے دلکش مزے - ذوق و شوق کی معجز تالیان خیالی
کرشمہ سازیاں - اور سینوں کی جھٹکین انسان کو خسر الدنیا و الآخرة بناتی ہیں -
ان سب ناشائستہ اور بے ہودہ حرکتوں سے بچانے والا صرف ایک
عہد پیری ہے انسان ہی پر کچھ موقوف نہیں موجودات عالم میں ہر شئی کی جوانی
سے پیری اچھی معلوم ہوتی ہے -

اسی پر فلک کو دیکھیے اگر چہ اسکی جوانی کے دیکھنے والے نابید ہیں -
اور خدا جانے اُس عہد میں کون لوگ تھے - لیکن قرینہ کہ رہا ہے - کہ پہلی
جوانی کا زمانہ کوئی یادگار عہد نہ تھا - اور اس بہن کوئی ایسا تاریخی واقعہ
پیش نہیں آیا جس کو لوگ یاد رکھتے -

ہاں پیری کے کارنامے آب زر سے لکھے جاتے ہیں اور اُن سے
دنیا سبق حاصل کرتی ہے - بڈھوں کی مناسبت اور خفیہ مغزی کا ثبوت شعراے
عجم کے کلام سے بہت کچھ ملتا ہے - جامی علیہ رحمۃ فرماتے ہیں - شعر -

بکا رہے بنگان رو آ رہا جانی	مکن زمین بیشتر کار خامی
چہ باشد بخت کی آزادہ بودن	جھاگ نیسی آئنا دہ بودن
جوانی تیرگی بردا ز دیارت	منور شد ز پیری رو دگار ت
برآمد ظلمت کو رسی و دوری	برآمد نہرا شیب لوری

شعراے فرس میں حضرت مصلح الدین شیخ سعدی علیہ رحمۃ جس پایہ کے شاعر
تھے ظاہر ہے - اُن کے اجلاس کا فیصلہ بوڑھوں ہی کو ڈگری دے رہا ہے -
فرماتے ہیں - شعر -

مترس از جوانان شمشیر زن

خدا کن ز پیران بسیار فن

جوانی برآمد ظلمت و سیاہی ہے پیری "الشیب نواری" ہے صحبت سے
نوشی میں باغ ہو - شب مہ ماہ ہو - ابر ہو - ترشح ہو - معشوق ہو - ہر دہو -
سب لوگ ہوں لیکن ایک پیر مغان نہو - تو اظہت نہیں -

مسجد میں ہزار ہا نوجوان نازی ہوں مگر جب تک کوئی بوڑھا پیش نماز

نہ ہو وہ خشوع و خضوع نہیں حاصل ہوتا۔ واعظ اگر جوان ہے تو اس کی نصیحت اثر نہیں کرتی۔ اور سن رسیدہ استاد کی خدمت باعث عظمت تصور کی جاتی ہے۔

سکندر اعظم نے جو روسے زمین کے بحر و بر کو فتح کر لیا اس کا یہ سبب نہ تھا کہ اس کے پاس جوانوں کی فوج جڑا رہتی، بشمار دولت تھی۔ بلکہ ان فتوحات کے باعث ارسطو طالیس جیسے چند بو جڑے کو زہ پست حکمائے جن کے حسن تدبیر نے اسے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دیا۔

قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنے کمال کو پہنچ کر اچھی علوم ہوتی ہے۔ ان عالیشان نامکمل عمارتوں کو دیکھو جنکی ابھی حیرت نہیں ٹپی ہے۔ دروازے لگانا باقی ہیں۔ نہ استرکاری ہوئی۔ اور نہ بیل بولے بنائے گئے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کی عمارت ہے جب تک اپنے حد کمال یعنی شیخوخت کے زمانہ کو نہیں پہنچ لیتی ناقص رہتی ہے اور اسے کوئی عزت و حرمت نہیں حاصل ہوتی۔

اگلے بڑھون نے جو کار نمایاں کیے ہیں وہ صفحہ روزگار سے ہرگز نہیں مٹ سکتے۔ حضرت خضر علیہ السلام باوجود اس کبیر سنی کے اپنے متعلقہ کاموں کو کس سرگرمی سے انجام دیتے اور خدا الٰہی بہر کی سیر کرتے پھرتے ہیں بھلا کوئی ان مقدس بڑھون کی مثال موجودہ جوانوں میں بھی دکھا سکتا ہے۔ پیری ہر دل عزیز ہونے کا منصب اس سبب بھی رکھتی ہے کہ طفلی کے بیوفا ایام لہو لعب میں گزرا جاتے ہیں۔ اور جوانی دیوانی مشہور ہے۔ بھلا وہ کب ساتھ دینے والی ہے۔

ان دنوں ہم کبھی ایک نازق ترین حسین کے شہزادہ بنتے ہیں۔ اور پھر اس کے زرخ زیبایہ اپنی ساری مسرتوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ کبھی صحبت و عظیمین شریک ہو کر ناصح کو مضحکوں میں اڑاتے ہیں۔ غرض کہ جوانی کے سب کرشمے قابل اعتبار نہیں ہیں وفاداری جو ایک اعلیٰ جوہر ہے اور اخلاق انسانی کی سب سے بڑھی چیز صفت ہے جس کے پاس یہ جوہر نہیں وہ انسانیت میں بہت ناقص ہے۔ یہ صفت شخص پیری میں پائی جاتی ہے۔ اسکی وفاداری کا ثبوت یہ کیا کم ہے کہ جب سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اسوقت یہ آتی ہے۔ اور جہاز سے بکے ساتھ جاتی ہے۔ بڑے

وقت کی اولاد بھی شریک نہیں ہوتی۔ مگر پیری ایسے عالم میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اور اسی کو پہلو میں دبا کے ہم کچھ خد میں آرام سے سوتے ہیں۔
سنے میں شیخ سعدی نے پیری کے مبارک آیام میں علم و فضل حاصل کر کے ایسا نام پیدا کیا کہ جو آج تک ضرب المثل ہے۔ دیکھو یہ اگلی ٹوٹی چھوٹی عمارتیں یہ پورانی چھتیں اگرچہ پیری کے سب سے اپنے دانت نکال چکی ہیں اور بعض کمر خمیدہ ہو گئی ہیں اور بعض بوسیدگی کی وجہ سے پیر خانی ہو چکی ہیں لیکن اب بھی اچھے اچھے جوان معمار ان عمارتوں کو دیکھ کر کان پکڑ لیتے ہیں کہ انکا مثل و نظیر ہماری دستکاری سے غیر ممکن ہے۔ یہ اگلے ہی بدھون کی کراست ہے کہ ہزار برس کے بعد بھی دنیا میں اپنا نقش مستی دکھا رہے ہیں۔ شعر

از نقش و نگار در دیوار ہے
آثار پدید است صنادید عجم را

جس طرح نبوت شیب کے زمانہ میں عطا ہوئی اسی طرح اول خلافت کا سہرا ایک بڑھے خرد آزما معاملہ فہم کے سر باندھا گیا حضرت ابو بکر صدیق اگرچہ سن میں بہ نسبت سب صحابہ کے مسن تھے مگر دور اندیشی اور تدبیر نے ایک کار آزما اور ممتاز تدبیر ثابت کر دیا تھا عراق و عجم روم و شام بصرہ و دمشق میں نمایان فتوحات حاصل کیں۔ جو ان کی عشق عاشقی ناپاک اور مجازی ہو ا کرتی ہے اور بوڑھون کا عشق معشوق حقیقی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

ہفت

اپنے آپ کو آماج گاہ حوادث۔ اور مصائب کے زعمین گرفتار دیکھ کے کچھ ایسی الجھن ہوئی۔ اور دل وحشت زدہ ایسا گھبرا گیا کہ گھر چھوڑ کے گلی کو چون میں ٹھوکرین کھانا شروع کیں۔ اور جب آبادی میں بھی دل نہ لگا تو صحرائی راہ لی۔ صحرا سے قنوق و قنوق کی سمت اگرچہ سبک رو نظر کے لیے کافی تھی مگر باد پیا سے خیال کو وہ بھی تنگ نظر آیا۔ اور ہر طرف پہاڑوں کی حد بندی دیکھ کے خیال نے ادھر ادھر دوڑ دوڑ کے پہاڑوں اور چٹانوں سے سرکارا شروع کیا۔

ناگمان میدان میں ایک مدور چیز نظر آئی۔ جو اپنے مقام پر بٹھری ہوئی تھی اور رہبر
خیال کے پاؤں میں بار بار اُس کی ٹھوکر لگتی تھی۔ اور گویا ایک چشم منظر تھی کہ اپنے
مشتاقوں کو سامنے کی فضائیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اُس کی اشتیاق بھری صورت دیکھ کے
دل پر ایک چوٹ سی لگی کہ آہ اس کا ذوق و شوق دیکھو۔ اور جن کے دید کی اسے آرزو
ہے اُن کی بے پروائی و غفلت شناری دیکھو۔ نہ کسی کو خبر ہے۔ اور نہ کسی کا پتہ ہے۔
ور د بھر سے دل میں ہمدردی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ دل نے کہا اپنی آرزو پوری ہو یا نہ ہو
جس طرح بنے اُسے ڈھونڈ نکالنا چاہیے جس کا اسے شوق ہے۔

ناگمان سامنے ایک مجمع دکھائی دیا۔ اور عالم خیال میں نظر آیا کہ جیسے اُس منتظر کی
چشم شوق میں کچھ تسکین سی پیدا ہو گئی۔ دل نے کہا کہ جس سراپا ناز کو چشم منظر ڈھونڈ
رہی تھی ہونہ ہو اسی گروہ میں ہے۔ امید پیدا ہوئی کہ اب ناز و نیاز اور دل ہی و دل
کا اچھا تاثرات نظر آئے گا۔ حسرت نصیبوں کے لیے اس سے ابھی سیرکمان نصیب ہو سکی ہے کہ
معتشوق طناز جلوہ نمائی و نازا فریبی میں مشغول ہو اور دیدہ شوق موتا شاہے یار ہو کے
بانگ مہین کی گنجینی کر رہا ہو۔ یہ پُر لطف منظر دیکھنے کے لیے ٹھہر گئے۔ بیتاب نگاہیں کبھی اُس
دیدہ متوق پر ہوئیں۔ اور کبھی اُن نو واد آئے والوں پر۔ گویا کشش عشق انہیں کھینچ
کھینچ کے آگے بڑھا رہی تھی۔ اور چشم منظر سے ساعت بہ ساعت مسرت کے آثار
نمایان ہو رہے تھے۔ "عمر سب" بلند کرتے تھے۔

دل حیران نصیب یہ سیر دیکھتے دیکھتے ہوش میں آ کے بولا "اب آج ہی جذبہ محبت
کا امتحان ہو جائے گا یہ عشق میں خود داری صحیح ہو گی کہ کس طرح عشق کی زیون میں بندھا ہوا
کچھ نچلا آتا ہے۔ اور دیکھیں کشش عشق اُسے کمان تک کھینچ لاتی ہے" اس خیال کا
آنا تھا کہ وہ سب لوگ ایک حد تک پہنچ کے ٹھہر گئے۔ ساتھ ہی دل زور سے دھڑکا
کہ خدا خیر کرے۔ اُس منظر دیدہ حیران کی محرومی پر انوس کر رہے تھے کہ آنے والا گروہ
ایک صف میں پھیل گیا۔ اور میں جو اُس چشم منظر کے پاس کھڑے تھے کلم دیا گیا کہ وہاں
سے ہٹ جاؤ تمہارا اتنا ظرف نہیں کہ اُس شہ جگر عاشق جفاکش کے برابر کھڑے ہو۔

اگرچہ دل نہیں چاہتا تھا مگر مجبوراً ہٹنا پڑا۔ کیونکہ دلی جذبہ عام اس سے کہ وہ یہی
کے ہوں یا دلبری کے خلوت و تنہائی چاہتے ہیں۔ نہ جوش عشق ہی نامحرم اور غیر کا متعل ہے۔

اور نہ بلوہ نمائی و ناز آفرینی ہی اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دور جا کھڑے ہوئے
لیکن ایسی جگہ جہاں سے دونوں طرف کے ناز و نیاز بخوبی نظر آسکتے تھے۔ کیونکہ ہماری نظر تھی
اگر اس سیر کا لہکا تھا کہ وہاں میں جس عشق کے جذبات کیارنگ دکھاتے ہیں۔ فرق کی
کٹھن راتیں دیکھی تھیں۔ ہجران نصیبی کا قیامت خیز زمانہ دیکھا تھا۔ اگر نہیں دیکھا تھا تو خیال
کا جلوہ۔ اور جس عشق کی بجائی۔ اور اس کا سماں یہاں سے اچھا کمان نظر آسکتا تھا؟
مگر آہ وصل کی شان و بجز و فراق سے بھی زیادہ اند و مہناک نظر آتی۔ سمجھتے تھے کہ
ہمارے بہت آنے اور بہت کے انخیار سے خالی ہو جانے کے بعد عشق و دلربا قدم آگے بڑھا
اے اور قریب آئے گا۔ بوس و کنار ہم آغوشی و بغیری نہیں تو پاس سے کچھ راز و نیاز ہی کی
باتیں ہون گی۔ مگر نہیں۔ ان لوگوں نے پیٹے ہو اس اپنے شقائق دیدہ نگران پر نظریں
جمادین۔ اور پرنہ و قین اٹھا اٹھا کے نشانہ بازی شروع کی۔ ہر ایک کو یہی دھن تھی کہ اس
سراپا شوق کھلی ہوئی آنکھ ہی کو نشانہ بنائے۔ گویوں پر گولیاں پڑ رہی تھیں۔ اور لوگ
باہم ایک دوسرے کی قادر اندازی کی داد دے رہے تھے۔ مگر شوق دیدار سے کہتے
ہیں کہ اسد با گولیاں پڑ گئیں۔ کیسے میں تیروں زخم پڑ گئے۔ سینہ بھلنی ہو گیا۔ مگر چشم شوق
جس طرح کھلی تھی اسی طرح کھلی رہی۔ مجال کیا کہ تیروں پر بل بھی آیا ہو۔ گویا اس شفاق
دیدہ نے اپنا سینہ سپر کر دیا تھا۔ اور ہر ضرب پر زبان شوق سے یہ شعر نکل جاتا تھا۔
تیرے تیر نکش کو کوئی میرے دل سے پوچھے یہ غلش کمان سے ہنوک جو جگر کے پار ہوتا
ادھر سے لگتا تو گولیوں کی بوجھا رہی۔ اور ادھر سے گویا صبر و تحمل کی زبان سے نعرہ
ہل میں مزید بلند تھا۔ آخر شوق جفا کشی نے دست ستم کو تھکا دیا۔ سب لوگ اپنا شوق ستم
پورا کر کے چلے گئے۔ اور میں نے با چشم پر نم پیر اسی شتاق دیدہ۔ اور اسی دیدہ نگران
کے پاس تائے اس کے ذوق ستم کشی کی داد دی۔ کچھ دیر تو میری طرف دیدہ حیرت سے نگران
رہا۔ پھر زبان حال سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا۔ میں اسی لیے ہوں۔ اسی واسطے آنکھیں
کھولے اور سینہ سامنے کیے رہتا ہوں کہ میں کی دید کا لہکا ہے اُن کا شوق پورا ہو۔ ذوق عشق
کی دنیا میں بھی بیرون کا نام نہ ہو۔ یہاں تو جفا کشی کا شوق ہے۔ معشوق کے تیروں کا دل
و جگر میں پروست ہونا۔ اور یار کے نشانوں کا آنکھوں پر لینا اپنا ستار ہے۔ ستم اس کے
لیے ستم ہے جسے ضبط و تحمل کی طاقت نہ ہو۔ وہاں تو اسینہ دوستوں کے ہاتھ کی گولی



ہم کہان تھے اور کہان مین

زمانہ کبھی کسی کو ایک حال پر قرار نہیں لینے دیتا۔ دنگد از ہی کو دیکھئے کہ پہلے کہن مین تھا۔ ۱۸۹۵ء مین حیدر آباد فرخندہ بنیاد مین آیا۔ اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ سب مین پھر لکھنؤ پہنچا۔ وہاں سردار محمد زمان سے کبھی بنا اور کبھی بگاڑا۔ گرا اور پھر اٹھا۔ نظروں سے غائب ہوا۔ اور یکایک پھر نظر آیا۔ اور آخر ہم نے عہد کر لیا کہ اسد پانوں توڑ کر لکھنؤ ہی مین بیٹھیں گے۔ لیکن عہدوں کا کر لینا آسان ہے اور بننا مشکل۔ ہم تو بنا مین گزرا نہ بھی بنا ہی نہ ہو۔ عالمگیر ہمارا جدِ سرکش پشاد بہادر مین السلطنت دارالہمام سرکار عالی کی قدر افزائی اور مولوی محمد عزیز مرزا صاحب متعدد عدالت و کو تو الی واسور عامہ کی محبت و عنایت پھر کشان کشان اسی سولو دکن مین لے آئی جسے اپنی تقدیری سے چھوڑ کے چلے گئے تھے۔ خلاصہ یہ کہ دنگد از اب پھر حیدر آباد فرخندہ بنیاد مین ہے۔ اور اعلیٰ حضرت ہندگان عالی مدظلہ العالی دام اقبالہ کے دامنِ عافیت مین۔

دنگد از درود غم کھتے سنانے اور آوارہ گردی و صحرا نوردی کی داستانیں بیان کرنے مین خاص کو چسپی رکھتا ہے۔ اور اسی رنگ نے اس کی آہ مین ایک اثر پیدا کر دیا ہے۔ ایسی صورت مین ممکن نہ تھا کہ جس کہانی کو دوبار بار

سنایا کرتا ہے اس کی کچھ کیفیت خود اس کی زندگی میں بھی نہ پیدا ہو جائے۔ دودھ خوردگی کی آوارہ گردی بیان کرتا ہے تو خود اسے بھی کسی نہ کسی حد تک آوارہ گرد مہونا چاہیے تھا۔ پتھر بھلا کیونکر ممکن ہے کہ کسی جگہ بیٹھنا چاہیں اور بیٹھ سکیں۔

خدا سے امید ہے کہ اس پہلے کسی دوسرے انقلاب اور تغیر سے سابقہ نہ پڑے گا۔ کیونکہ مرہون اور سرپرستوں کے ازدیاد دولت سے خود اس کی وضع و حالت میں ترقی ہو سنے کی امید کوئی بجا امید نہیں ہے۔

دولت از اسی تبدیل مقام و مکان اور صد ہا قسم کے دیگر ترددات کی وجہ سے پورے ایک سال تک بند رہا لکھنؤ میں ۱۹۰۰ء کے ماہ جون تک

نفل کے بند ہوا تھا۔ اب جولائی ۱۹۰۰ء سے پھر جاری کیا جاتا ہے۔ جن احباب اور قریب و انون کا حساب جون ۱۹۰۰ء میں ناقص چھوٹا تھا ان کے حساب کا مکملہ ۱۹۰۰ء یعنی موجودہ سال کی آخری شش ماہی میں ہو جائیگا۔

جو اخبار اور رسالہ سب دل میں جاری رہے ان کے معزز ایڈیٹروں کے ہم نہایت شکر گزار ہیں۔ اور جن حضرات نے تبادلہ میں پرچہ بند کر دیا ان کی خدمت میں یہ پرچہ بھیج کے التماس ہے کہ براہ عنایت اپنا پرچہ حیدر آباد دکن۔ محلہ نیل خانہ کے پتہ پر جاری فرما کے رہیں منت فرمائیں۔

شاہیر اسلام کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور امام ابو الحسن عری کی سلسلہ عری پینداہ بعد اپنے قدر دانوں کی تحمیل پہنچ جائے گی۔

دنیا ایک طلسم ہے

بڑے بڑے تجربہ کار محققوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ دنیا ایک طلسم ہے اور ہمیں ہمیشہ دھوکا دیا کرتی ہے۔ لیکن شاید اس پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا کہ اگر کیوں طلسم کہا گیا۔ اور اس نے کسے اور کیونکر دھوکا دیا۔ علمائے روحانیات نے اکثر اس کے طلسم ہونے کی توجیہیں بھی کیں۔ اور اپنے خلاق و خیال کو مطابق مکتا و دنیا کے مکر و فریب کو ثابت کر دکھایا۔ کسی نے اس کی بے ثباتی کو اس کا

مگر قرار دیا۔ کسی نے اس کی زیر نگینی بوقلمونی کو۔ مگر سچ یہ ہے کہ دنیا کا طلسم ہونا پوری وضاحت سے نہیں دکھایا جاسکا۔ اگرچہ اس کے ایک عجیب و غریب طلسم ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔

آپ اگر ذرا بھی غور کریں گے تو نظر آجائے گا کہ دنیا کی ظاہری حالت ہمیں ہمیشہ دھوکا دیا کرتی ہے۔ ہوتا کچھ ہے۔ اور نظر کچھ آتا ہے۔ ہم جانتے کچھ ہیں اور ملتا کچھ ہے۔ پروانے کی طرح ہم ایک نور و شمع کے دوڑتے ہیں مگر وہاں پہنچ کے بجائے نور کے مار ملتی ہے۔ اور قبل اس کے کہ اس کی مصیبت کا احساس ہو جل گئے خاک ہو جاتے ہیں۔

ذرا شمال کی طرف نظر دوڑاؤ۔ ہمالیہ کے اونچے سفید ٹیلے دور سے آسمان میں ملے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہی نروبان فلک میں۔ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم ان پر چڑھ گئے تو آسمان پر پہنچ جائیں گے۔ اور عالم ملکوت والوں سے جیتے جی ملاقات ہو جائے گی۔ مگر اُد پر چڑھ کے اور اس بلند ری پہنچ کے دیکھئے تو کھل جاتا ہے کہ آسمان جتنا دور نیچے سے تھا اتنا ہی دور وہاں سے بھی ہے۔

وہ دیکھو صحرا لے عرب میں رینگا روان دور سے دھوکا دیتی ہے کہ دریا بیکراں لہریں مار رہا ہے۔ بادیر گردن لب خوش ہو کے دوڑتا ہے کہ وہاں پہنچے اور آتش عطش بجھالی۔ اور جی بھر کے سیراب ہو گئے۔ مگر بھاس جا کے قریب خوردہ ستھر لگا ہون کو ادھر ادھر دوڑتا ہے تو اصل حقیقت کھلتی ہے کہ تھا کیا اور ہم کیا سمجھے تھے۔

آتش سوزان دور سے خوبصورت۔ روشن۔ سنہری۔ اور دلغریب نظر آتی ہے۔ دنیا کا کوئی حسن اس کے آگے فروغ نہیں پاسکتا۔ جہاں اس کی آب و تاب اس کے آگے مانپڑ جاتی ہے۔ چاند سورج کی روشنی انہی جگہ پر جا ہے کیسی ہی عالم افزو ہو مگر اس میں بھی ایک پھیکا پن ہے اور وہ دمک نہیں جو ایک دیکھنے والے انگڑائی میں ہے۔ مگر ذرا پاس جا کے چھوؤ۔ اور ہاتھ لگاؤ۔ تو قدر عافیت معلوم ہو۔ اس شمع کو دیکھو جو تمہارے سامنے ایک غم زدہ حسین کی طرح چمک چمک

پہلو بہار ہی ہے۔ سنا ہے کہ عالم مین ہے۔ اور تھقل و بردباری کی مجسم تصویر ہے۔
 اَمَّا عَزَّ وَجَلَّ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِیْمِ اُس کی اس بیکسی اور مایوسانہ حالت پر نجاؤ
 اُسی وقت تک کام کی ہے جب تک اسکی روشنی مین تم کسی کا پیار چہرہ دیکھ لیتے ہو
 اور دُور دُور رہتے ہو۔ قریب گئے اور اُس نے ایک زہریلے کچھو کی طرح
 ڈھکھا مارا۔

اب سنا گئے ہاتھوں اُس حسن پر بھی ایک نظر ڈال لو جس نے شاعری کی دنیا
 مین رنجوشی پیدا کی ہے۔ اور نوجوانوں کی بامقاصت توجہ مین ہل چل ڈال رکھی
 ہے۔ یہ حسین عورتوں کا زینیان عالم۔ اور زیادہ تر شاہان بازار کا حسن ہے۔ اس
 کے ظاہر ہی کرشمے تو یہ مین کہ گھونگھٹ کی آڑ سے ایک جھلک دکھا کے رخ
 زیا کو چھپا لیا۔ اور مشتاقان وید کے خبر مین جان پر ایک نہیں صد باجلیان پرین
 روزن در سے سر ملین چشم فتان کی مسانہ ادائی دکھا کے ہٹ گئیں۔ اور ہر
 دل اور ہر کلیجہ مین ناسور پڑ گیا ایمان تک بھی غنیمت تھا کہ ان کرشموں اور حسن
 کی ان ادائوں نے دنیا مین ہزار ہا عاشق پیدا کئے قیامت تو یہ ہے کہ ان نظر
 فریبیوں نے ہر نوجوان کو عاشق بنا دیا۔ لیکن اس حسن کی دلفریبان اُسی وقت
 تک مین جب تک اسے دُور سے دیکھیے۔ پاس جا کے دیکھیے اور خط و خال
 پر گہری نظر ڈالے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نالاشی حسن کے اندر کتنے عیب مین
 اور اگر ایک قسم کی زبردست کشش ہے تو کتنی طرح کی نفرت انگیز چیز مین موجود مین
 یعنی حسین صورت مین نظر آرہی مین اور جن کے مشق ستم کے سیم شاکی رہا کرتے مین اگر
 ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کیجئے تو حقیقت پر سے فریبی طلسم کا پردہ اٹھ جائے گا
 اور سو نہیں ہزار مین بھی ایک مشکل سے ایسی نظر آئے گی جو دل کو سینے کے قابل ہو
 اور یہ بھی اُس وقت تک ہے جب تک صرف جسمانی عیوب سے علاقہ رکھا جائے۔
 انہی تنقید اور پرکھ مین اگر اخلاقی اور روحانی عیوب کو بھی شامل کر لیجئے تو لاکھ کیا
 کروڑ مین بھی ایک ایسی صورت نہ نظر آئے گی جس مین حسن صورت کے
 ساتھ حسن سیرت بھی ہو۔

✓ خوارج

جس طرح کسی دلربا کے بگاڑ میں بناؤ اور اس کے مشق ستم میں ایک ادا ہوا کرتی ہے۔ بیسٹج ہر شریف اور راستباز قوم کی لغزشوں میں کوئی خوبی اور اس کے کفر و فسق میں بھی کوئی دل کشی ضرور نظر آجاتی ہے۔ بطور عروج اسلام کے بعد جب خوارج کا فرقہ پیدا ہوا ہے تو چونکہ وہ سب عربی النسل تھے اس لئے ان کی اس کفر و فحش سے بھی بعض اوقات عجب قسم کی دلچسپیاں نمودار ہوئیں۔

خوارج دراصل آج کل کے نہایت یا کوئی نہایت تھے۔ جن کا اصول نہ یہی یہ قرار پایا گیا تھا کہ کسی خلیفہ یا سربراہ سے سلطنت کی اطاعت نہیں جائز ہے۔ عام جماعت اسلامی تو یہ کہہ رہی تھی کہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" یعنی خدا رسول اور صاحب امر (فرمان روا یا حضرت امامیہ کے عقائد کے مطابق امام زمان علیہ السلام) کی اطاعت کرو۔ اور وہ کہتے تھے کہ ان "الحکم الا للہ" یعنی خدا کے سوا کسی کو حکومت کا حق نہیں۔ اپنے جھنڈے میں یہی آیت لکھی۔ اسی کو اپنا شعار بنایا۔ اور جس کسی کو خلیفہ یا بادشاہ ہونے کا دعوئے ہوا اس سے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ ان کو اس سے بھست نہ تھی کہ حکمران بنی ہاشم میں سے ہے یا بنی امیہ میں سے۔ عباسی ہے یا فاطمی۔ وہ ہر اس شخص کے دشمن تھے جسے یہ دعوئے ہو کہ بادشاہ کو اپنے اجتہاد سے احکام جاری کرنے کا ذرا بھی حق ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان لوگوں کی سرکشی سے جو کچھ ہوا شہور ہے۔ آپ کے بعد ان لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ پھوٹ پڑی۔ اور گویا ہمت ہار کے خاموش بیٹھ گئے۔ مگر عبداللہ بن زبیر اور عبدالملک بن مروان میں ہنوز خلافت کا تصفیہ نہیں ہونے پایا تھا کہ باسی کڑھی میں ابال آیا۔

اس کی بنیاد یوں پڑی کہ خوارج میں پھوٹ پڑنے کے بعد ان کا سردار منافق بن ازرق شہر ہواز کے بازار میں سکونت پذیر ہو گیا۔ چند روز کی خاموشی سننے

اُس کے دل میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ اپنے عقاید کے متعلق متروک تھا کہ ایک دن بی بی نے کہا ”اگر تم یہ سمجھے ہو کہ ایمان چھوڑ کے تم کافر ہو گئے تو اپنے دعوے سے باز آؤ۔ اور ساتھیوں کو چھوڑ دو۔ لیکن اگر یہ خیال ہے کہ کفر چھوڑ کے مسلمان بنے ہو تو کافروں (عام مسلمانوں) کو جہانِ مبین قتل کرو۔ اور قتل عام بول دو۔ عورتوں کو چھوڑ دو۔ بچوں کو۔ اور وہی موجود نوح علیہ السلام نے کہہ دیا تھا ”لا تذمر علی الارض من المصافرن دیناً“۔ ”زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑا“ بی بی کی یہ صلاح سنتے ہی نافع تلوار لے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے گروہ کو جمع کیا۔ اور ہر چار طرف قتل کا بازار گرم کر دیا۔ جس جگہ پہنچتا زن و فرزند کسی کو نہ چھوڑتا۔ اور کوئی اس بے رحمی کی شکایت کرتا تو جواب دیتا کہ یہ بڑے ہو کے اپنے باپوں ہی کے ایسے ہوں گے۔“

جب سوادِ عراق کے اطراف و جوانب میں ان لوگوں کا زور ہوا۔ اور بصرہ والوں کو اپنے لئے اندیشہ ہوا تو احنف بن قیس کے پاس گئے جو وہاں کے معززین میں تھا۔ خوارج کے ظلم و جور کی کیفیت بیان کی۔ اور کہا صرف دو منزلیں باقی ہیں۔ اُن کو سٹے کیا۔ اور وہ لوگ ہم پر آپڑے۔ احنف نے عام مسلمانوں کو خوارج کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ مسلم بن عبیس کنوئین پر مقرر مقرر کیا اور ابن عبیس دس ہزار اہل بصرہ کو لے کے روانہ ہوا۔ مگر جب بصرے کے پل کے اُس پار پہنچا تو ہجرا میں سے کہا اپنی لڑائی میں ہمیں سہم دے اور دولت و خشنمت کی بالکل امید نہیں۔ کیونکہ حریفوں کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ لہذا جو لوگ کسی دنیوی لالچ سے چلے ہوں وہیں جائیں اور جو خالص جہاد کے لئے چلے ہوں میرے ساتھ چلیں۔ یہ تقریر سن کے کچھ لوگ پلٹ گئے۔ اور باقیوں کو لے کے ابن عبیس کے پاس آ گئے۔

ابن عبیس جمادی الآخر ۶۵ھ ہجری کو مقام دولاب میں پہنچا تھا کہ نافع بن ارق کا سامنا ہو گیا۔ اور پھر کسی انتظار و تاہل لڑائی شروع ہو گئی۔ مدین فرتی عجب جوش اور حریت انگیز شجاعت سے لڑے۔ لڑنے لڑتے

سہان تک نوبت پہونچی کہ بہادر وں کے ہاتھ میں نیزے ٹوٹ گئے۔
 گھوڑوں کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے۔ اور ہزار آدمی مقتول و غرور ہو چکے تھے
 اب تلواروں اور گرزوں سے بلکہ دست بدست لڑائی ہو رہی تھی کہ دونوں
 لشکروں کے سرداروں یعنی ادھر ابن عیس نے اور ادھر نافع ابن ازرق
 نے موت کا جام پیا۔ اور دونوں فوجیں بے سر رہ گئیں۔ مگر دونوں سرداروں
 نے نفس واپسین سے پہلے اپنا جاننشین خود ہی منتخب کر دیا۔ ابن عیس نے
 ربیع بن عمر کو سردار مقرر کیا جو اجزم رہتے تھے، کے لقب سے مشہور تھے
 کیونکہ عبدالرحمن بن سمرہ کے ساتھ کابل کے جہاد میں ان کا ہاتھ بٹکا۔ ہو گیا
 تھا۔ اور ابن ازرق نے عبداللہ بن بشر کو۔ اور لطیف کی یہ بات تھی کہ یہ
 دونوں سردار ایک ہی قبیلہ یعنی بنی یربوع میں سے تھے۔

خوارج تعداد میں عام مسلمانوں سے کم تھے۔ شجاعت میں ان کے
 برابر تھے۔ اور جوش و خفقان کے لحاظ سے بڑے ہوئے تھے۔ اور جوش و
 خروش میں سچ۔ ہے کہ خوارج حد سے زیادہ گزرے ہوئے تھے۔ ان کی
 عورتوں تک نے غیر معمولی شجاعت دکھائی۔ ابن ازرق کو جس مسلمان نے
 قتل کیا وہ سلامہ نامی ایک باملی نثر او شخص تھا۔ وہ کہتا ہے میں اس کا کام
 تمام کر چکا تھا کہ خوارج میں سے ایک سوار سامنے آیا اور مجھ سے مقابلہ کرنا
 چاہا مگر میں نے ٹالا۔ تاہم اس کی یہ حالت تھی کہ جدھر میں جاتا ادھر کا رخ کرتا۔
 اور جہاں ٹھہرتا سامنے آ کے جم جاتا۔ اور کہتا "آئیے ہمارا آپ کا فیصلہ
 ہو جائے" آخر مجھے مجبوراً لکھنا ہی پڑا۔ قریب پہونچتے ہی ہم دونوں نے
 ایک دوسرے پر نیزہ مارا۔ اس کا نیزہ ٹوٹ چھا پڑا۔ مگر میرا نیزہ کام کر گیا۔ وہ شخص
 بیہوش زمین پر گرا۔ اور میں نے اس کا سر کاٹنے کا ارادہ کیا۔ اب جو
 دیکھتا ہوں تو وہ عورت ہے۔ اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ابن
 ازرق کی وہی جو روتھی جس نے اٹھارہ اور قتل عام پر آمادہ کیا تھا۔
 ان دونوں نے سرداروں کی ماتحتی میں میں دن سے زیادہ زمانہ تک
 دونوں قریبی لڑتے رہے۔ جن میں سے آخری دونوں کی لڑائی قیامت کی تھی

مسلمانوں کے سردار ربیع بن عروہ نے آخر خواب میں دیکھا کہ ان کا وہی ہاتھ جو کابل میں کٹا تھا آسمان سے اُتر آیا اور اُس نے انھیں بکڑ کے انہی طرف کھینچ لیا۔ اِس نینال سے انھیں اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ صبح کو اُنھوں نے جوش سے لڑے اور شہد ہو گئے۔ اب لوگ مسلمانوں کے جھنڈے کو ہاتھ لگانے لگے۔ کیونکہ دو آدمی اُسے اختیار کر کے جان دے چکے تھے۔ آخر کُریب بن عبد الرحمن کے جوش دلانے سے حجاج بن اِیاب نے مسلمانانِ بصرہ کا علم اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور ایسی قیامت خیز لڑائی ہوئی کہ لوگوں کو حیرت و شہر بھی بھول گیا۔ مغبین و رجم و برہم ہو گئیں۔ لوگ ایک دوسرے میں گتھو گئے۔ نیزہوں سے لڑ لڑ کے نیزے توڑ ڈالے۔ پھر تلواروں اور گرزوں کو ہاتھ میں لیا۔ اور یہاں تک لڑے کہ مارے تھکن کے دست و بازو نے جواب دے دیا۔ حریت پر حملہ کرتے تو کارگر نہ ہوتا۔ نو بت یہاں تک پہنچی کہ جھنڈا جھنڈا کے پتھر اُٹھاتے اور حریت پر دے مارتے۔ غیظ و غضب و دشمنوں کو گالیان دیتے۔ اور اپنی بے بسی پر غصہ کر کے رہ جاتے۔

حجاج بن اِیاب نے بڑی جان بازی سے مقابلہ کیا۔ مگر لڑائی کا کسی طرح فیصلہ ہونے ہی کو نہ آتا تھا۔ یکایک اُس سے اور ایک خارجی بہادریان بن حوث سے مقابلہ ہو گیا۔ اور دونوں حریفوں نے عیش میں آ کے دشمن پر اس زور سے وار کیا کہ دونوں وارکاری پڑے۔ اور دونوں اپنی اپنی جھنڈ پر گر کے ٹھنڈے ہو گئے۔ اتنے میں لوگوں نے درمیان میں آ کے ہجوم کیا۔ اور رات ہو گئی۔ صبح کو بہت سے اہل بصرہ بھاگ کھڑے ہوئے اور بہت سے بہادر میدان میں قدم جمائے کھڑے تھے۔ اب اُنھوں نے حارث بن بدر کو اپنا سردار منتخب کیا۔ مگر کوارج کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ عمران جو حجاج کے مقابلہ میں مارا گیا تھا اُس کی مان نے بیٹے کی لاش پر نہایت ہی پُر اثر مرثیہ پڑھا۔ جس کا پہلا شعر تھا۔

اللہ ایتد عمراناً وطهره
وکان عمران یدعو اللہ فی الحما

مے خدا عمران کی مدد کرے اور اُسے پاک کرے۔ اور عمران صبح کی وقت اللہ کو پکارا کرتا تھا

اب حارثہ نے مسلمانوں کو ابھار کے لڑانا شروع کیا۔ عرصہ جنگ کرم تھا کہ خوارج کی کچھ کمک آگئی۔ اور حارثہ کو مجبوراً راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ سب بھاگے اور خوارج نے تعاقب کیا۔ راستہ میں دھڑ پڑا۔ جس میں بہت سے مغرور مسلمان بھانڈے اور ڈوب ڈوب کے مر گئے۔ صرف اتنا خوا کہ مسلمانوں میں سے بنی عبدالقیس کی ایک ٹکڑی بھاگی ہوئی جا رہی تھی کہ تعاقب کرنے والے خوارج اُن کے سر پر پہنچے۔ مسلمان زندگی سے یابوس ہوئے تو دشمنوں پر پلٹ پڑے۔ اور اتفاقاً کچھ عجمی تھیم کے لوگ بھی مدد کو پہنچ گئے۔ اور دونوں کی اس بہادری سے لڑنے کے خوارج کو پس پا ہونا پڑا۔

اب حارثہ اور بقیۃ السیف مسلمان بصرہ تہر تہری کے کنارے اتر پڑے۔ اور وہاں سے قریب ہی شہر اہواز میں خوارج نے بڑا دڈالا۔ اور پھر ہر روز میدان میں آ کے ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ لیکن عجب قسم کی مزہ دار لڑائی ہو کر تھی۔ مسلمان اور خوارج باہم لڑتے مرنے۔ کبھی لڑتے لڑتے ایک دوسرے کو روک کے امن و امان سے باہم باتیں کرتے۔ دینی و دنیوی مسائل چھیڑ جاتے۔ اور ایسا سلوک ہوتا کہ گویا ان میں اختلاف ہی نہیں ہے۔ اور پھر جب جی چاہتا توک کے اور جتا کے لڑائی شروع کر دیتے۔

ایک مرتبہ خوارج کی طرف سے عبیدہ بن ہلال یثربی اور مسلمانوں کی طرف سے ابو خراہیمسی باہم مصروف کارزار تھے کہ عبیدہ نے لڑائی سے ہاتھ روک کر کہا ”اے ابو خراہیم! میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ بھلا تم سچ بتاؤ گے؟ ابو خراہیم نے کہا ”جی ہاں۔ تم سچ سے کہتم بھی سچ بولنے کا وعدہ کرو۔“

عبیدہ ”ہاں ہاں میں بھی جو بات سچ ہوگی بتا دوں گا۔ ابو خراہیم۔“ تو پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ عبیدہ ”تمہارا اپنے فرمان روادوں کی نسبت کیا خیال ہے؟“

ابو خراہیم ”ہمارے حکمران وہ جس کا مارنا جائز ہو اس کے قتل کا فتوے دیتے ہیں اور حرام مال اور حرام عورت کو مباح کر دیتے ہیں۔“ عبیدہ ”تو کجخت یہ بتا کہ ملک کے معاملے کی نسبت اُن کا کیا طرز عمل ہے؟ ابو خراہیم ”جو رقم نہیں جائز اُسے وصول کرتے ہیں اور اُسے اُس محل پر صرف کرتے ہیں جہاں اُس کو صرف کرنا جائز نہیں۔“

عبیدہ: ”اچھا بتا دیتیم کے ساتھ ان کا کیا سلوک ہے؟“ ابو خراہ: ”اس کی جائداد غصب کرتے، اس کے حقوق سے اسے محروم کرتے۔ اور اس کی ماں سے برا کام کرتے ہیں۔“ عبیدہ: ”خوب۔ تو بخت تم لوگ ایسے امانتوں کی پیروی کرتے ہو؟“ ابو خراہ: ”خیر تمھاری باتوں کا تو میں جواب دے چکا ہوں یہ لیکن طعن چھوڑو کے فوراً میرے سوالوں کا جواب دو۔“ گروہ کی صورت سچ بتانا کہا اچھا پوچھو۔ ابو خراہ: ”بتاؤ کون سی شراب اچھی ہوتی ہے۔“ صمراؤن کی یا پہاڑوں کی؟“ عبیدہ: ”مجھ سے اور یہ سوال بالاحول ولاقوۃ۔“ ابو خراہ: ”اس کی سند نہیں آپ کو بتانا ہوگا۔“ عبیدہ: ”خیر تمھیں اصرار ہی ہے تو سنو۔ پہاڑوں کی شراب قوی اور تیز ہوتی ہے اور صمراؤن کی شراب اچھی اور خوشگوار۔“ ابو خراہ: ”کہان کی کبیاں اسے فن میں زیادہ اچھی ہوتی ہیں۔“ رام ہر فرکی یا ارجان کی؟“ عبیدہ: ”استغفر اللہ بھلا مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہو؟“ ابو خراہ: ”دیکھیے آپ عہد کر چکے ہیں مگر نے کی سند نہیں؟“ عبیدہ نے مجبور ہو کر کہا: ”اچھا یہ بھی بتاتا ہوں رام ہر فرکی کبیاں صحت اور میل جول میں اچھی ہوتی ہیں۔ اور ارجان کی کبیاں صورت شکل کی اچھی ہوتی ہیں۔“ ابو خراہ: ”اب بتاؤ جریر اور فرزوق میں سے کون بڑا شاعر تھا؟“ عبیدہ: ”تم پر اور ان دونوں پر خدا لعنت کرے“ پھر عبیدہ نے ایک شعر پڑھ کے پوچھا: ”یہ کس کا شعر ہے؟“ ابو خراہ: ”جریر کا۔“ عبیدہ تو وہی دونوں میں اچھا ہے۔“

اصل یہ ہے کہ لوگوں میں جریر اور فرزوق کے بارے میں بڑا اختلاف تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن بہت سے لوگ مل کے حاکم ابھرہ مہلب کے پاس گئے کہ آپ اس بارے میں فیصلہ کر دیجیے۔ اس نے کہا میں ان دونوں کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ جس کسی کے بارے میں فیصلہ کروں گا وہ مجھ پر چلتا رہے گا (یعنی میری جھجکے گا) لہذا میں تمھیں ایسے فیصلہ کرنے والوں کا پتہ بتائے دیتا ہوں جن کو ان کا جس قدر بھی چاہے کوس لین۔“ پوچھا: ”وہ کون لوگ ہیں؟“ کہا: ”جب خوارج سے تم سے مقابلہ ہوا اور تمھارا کسی خارجی سے سامنا ہو جائے تو اس سے یہ سوال کرنا: اسی سے یہ تمام سلاطین اور خلفائے نبی امیر پر اعراض ہے جن کے خراج خلافت تھے۔“

قرار داد کے مطابق ابو خباب نے یہ سوال ابو عبیدہ سے کیا۔ اور اُس نے جریر کے موافق فیصلہ کر دیا۔

تین دن تک لڑائی کا یہی رنگ رہا۔ اور اسی قسم نے واقعات پیش آئے رہے۔ پھر اہل بصرہ اسے گھر گئے۔ اور خوارج کے بھی تعاقب نہیں کیا۔ بعد کے زمانے میں خوارج کا مار ہا زور ہوا۔ اور سلطنت سے لڑائیاں ہوئیں۔ مگر اس مہم کا اسی واقعہ پر خاتمہ ہو گیا۔

ان باتوں کو سچ یہ ہے کہ مذہب اور عقائد سے تعلق نہیں بلکہ یہ عربی قوم کی سچی شجاعت کے خصائص اور اُن کے قومی شعار تھے۔ یہ انہیں کے میدان جنگ کے ساتھ مخصوص ہے کہ رزم میں رزم کا مزہ آجاتا ہے۔

ترکان آل عثمان

اس خفیہ بردہ فروشی کی کیفیت مشہور وزیر خواد پاشا کی بی بی بیہ خاتم کی مندرجہ ذیل سرگزشت سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس خاتون نے یہ کام اس شوق میں شروع کیا تھا کہ شوہر کے دست نگر ہونے سے بے پروا ہو کے ذاتی سرایہ فراہم کرے۔ یہ کام اُس نے ایسے اہتمام سے کیا کہ چند ہی روز میں اُس کی مجلس قابل بیچ و خرید لوگوں کا عظیم الشان رنگ اسکو بن گئی۔ اس قسم کی تعلیم پائی ہوئی بہت سی لڑکیاں بیہ خاتم کے پاس جمع ہو گئیں تو اُسے اندیشہ ہوا کہ ان سب کا خوراک کھانا دشوار ہے۔ اور اس دشواری کے دور کرنے کے لئے وہ عمل اور تدبیر سے کام لینے پر آمادہ ہوئی۔ چنانچہ روپوں کی تبدیلی ہاتھ میں لئے ہوئے ایک بوڑھے خوجہ (ظا) کے پاس گئی جو ایشیا سے کوچک تو آیا ہوا تھا اور اعمال و فہم میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ بیہ خاتم نے اُس سے مدد چاہی۔ لہذا صاحب نے چند اثر فرمان لے کے مدد کا وعدہ کیا۔ اور چند روز بعد اس خاتون کے پاس سے چھپا کر ایک بار کت کرنا بیٹھا۔ اور بتایا کہ یہ کتنا جس لڑکی کو پھنچا جائے گا ایسی حسین نظر آئے گی کہ جو اس سے دیکھے گا وہ سمجھتے ہی فریفتہ ہو جائے گا۔ اب اس کُرتے میں خدا جانے یہ خاتون تھی یا نہ تھی۔ لیکن بیہ خاتم کو اعتراف تھا کہ وہ کتنا پھنکا کے جو لڑکی خریدار کے سامنے

پیش کی گئی خریدار صورت دیکھتے ہی والدہ شدید اہو گیا۔ اگرچہ یہ یقینی بات ہے کہ ان ڈربائیوں میں خود لڑکی کے حسن و جمال اور بہتہ خانم کی ناموری کو بھی لڑتہا گل تھا غرض عام حالت یہ ہے کہ دولت عثمانیہ میں لونڈیوں کے لئے کوئی شکایت کا محل نہیں۔ ان میں جو صاحب حسن و جمال ہوتی ہیں ابتدا ہی سے قیمت کی دھنی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ کیونکہ بہت سے ترک مختلف اسباب سے لونڈی کو بی بی پر ترجیح دیتے ہیں۔ آزاد لڑکی سے نکاح کرنے میں دولہا اور اس کے والدین کو بہت صحت کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ رونمائی، چڑھاوے کے جوڑوں اور دعوت کی محفل میں بہت روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں شادی کے لئے لازمی ہیں۔ جن سے مفر کی صورت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ لڑکے کا باپ اگر کسی شریفیت خاندانی اور ہم رتبہ لڑکی کے بیاہ لانے کے مصارف نہیں برداشت کر سکتا تو لڑکے کے لیے ایک لونڈی خرید لیتا ہے جو کسی مقیم خاتون کے حرم کی تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ اور جس کے ہاتھ آئے میں سوا زر قیمت کے اور کسی قسم کے مصارف کا بار نہیں اٹھانا پڑتا۔ لونڈی چونکہ کوئی ذاتی وجہ نہیں رکھتی اسلئے اطاعت کیش اور فرمان بردار ہوتی ہے۔ اور اپنے آقا و مالک کے خوش کرنے ہی کی فکر میں رہا کرتی ہے۔ نہ اس میں فضول جلیہ بہانے ہوتے ہیں۔ اور نہ حد سے گزری ہوئی ہوسیں۔ اور نہ اس کے کوئی عزیز و قریب ہوتے ہیں جو اسکی طرف سے لڑنے کو آمین۔ برخلاف اس کے آزاد عورت پوری طرح اپنی حقوق سے واقف اور ان کو حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ اور پھر اپنے نیکو والدین کو اسے ان گوشنوں میں جو مدد ملتی ہے وہ شوہر کو اکثر اوقات نہایت ہی ناگوار ہوتی ہے۔ لونڈی کے بطن سے اگر کوئی اولاد ہو جائے تو پھر وہ فروخت بھی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ کوئی حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ اپنے لڑکے کے باپ کے گھر ہی میں رہ کے اسکی پرورش کریں اس کے بطن کی اولاد صبح اولاد خیال کجاتی ہے۔ اور اگر آقا کے پاس کوئی بی بی ہو اور اس کے بھی اولاد ہو تو لونڈی اور بی بی کی اولاد باپ کی ترک میں برابر حصہ پاتی ہے۔ اکثر اوقات تو یہی ہوتا ہے کہ مالک اولاد ہو جانے کے بعد لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح پڑھاتا اور اپنی بی بی بنا لیتا ہے۔ ایسی صورت میں گھر کے اندر اسکی غربت و محنت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور ایک شریف ترک خاندان کی بیگم کے جو حقوق ہوتے ہیں اب

اُسے حاصل ہو جاتے ہیں۔

لاولدمیان بی بی اور نیز بے اولاد بیواؤں کا بھی قاعدہ ہے کہ خدا اولاد سے محروم رکھتا ہے تو کسی لونڈی کو لے کے اور بیٹی بنا کے پال لیتے ہیں۔ یہ بیان کر چکر ہیں کہ لہجی سلطانہ بھی اسی قسم کی ایک گرجن لڑکی تھی جسے محمد علی پاشا پہلے خدیو مصر کی بیوی بنے جو "مصر لی خانم" کے لقب سے مشہور تھیں بیٹی بنا کے پالا تھا۔ وہ بہت ہی ننھی بچی تھی کہ ایک بردہ فروش اور بہت سی لونڈیوں کے ساتھ اسے بھی لایا۔ اور اپنی تمام لونڈیوں کو محل میں لائحہ کے لئے پیش کیا۔ مصر لی خانم نے یہ کہہ کے کہ ابھی بہت چھوٹی ہے واپس لیجا لئے کا حکم دیا۔ اتفاقاً حرم سرا کی ایک کلفہ کی اسپر نظر پڑ گئی اور خدا نے اُس کے دل میں محبت ڈال دی۔ اُس کلفہ نے اُسے رکھ لیا۔ حمام میں لیجا کے خوب نھلایا۔ اور مصر لی خانم کی ایک لڑکی جو چند روز پہلے مر گئی تھی ابھی کچھ بچے اس ننھی بچی بسبی کو پنھا کے اپنی بی بی کے دیوان خانہ میں سلا دیا۔ مصر لی خانم کو دیوان کے اندر اور اپنے پہلو کے برابر اُسے سوتا دیکھا تو متحیر ہو کے اُس کی کیفیت کو بھی اُس کلفہ نے سب حال بلا کم و کاست کہہ سنایا۔ اور عرض کیا کہ خانم یہ بہت ہی پیاری اور خوب صورت بچی ہے۔ میری خوشی ہے کہ حضور اسے اپنی دلغ و بجانے والی بچی کا عوض پال لیں۔ اور خیال کریں کہ خدا نے اسے اُس کی جگہ دیا ہے۔ یہ بات مصر لی خانم کے دل میں بٹھ گئی۔ بسبی کو بیٹی بنا کے پالا۔ اور اس کی قیمت ایک ریشمی تھیلی میں لکھی۔ اور اُس تھیلی کو بسبی کے گرتے کے دامن میں پلیٹ دیا۔ پھر بسبی کو اٹھا کے کھڑا کیا تو تھیلی کھل کے اُس کے قدموں کے پاس گر سی۔ جہاں سے کسی نے اٹھا کے تاجر کے پاس پہونچا دیا۔ اس رسم سے مقصود یہ تھا کہ بسبی عام قسم کی لونڈی نہیں بلکہ بیٹی سمجھی جائے۔ اور مصر لی خانم میں اور اُس میں ہمیشہ مان بیٹیوں کے سے تعلقات قائم رہیں جب انظار زمانہ سے یہ بسبی سلطانہ بننے کے بعد ایک ناکام و نامراد بیوہ رہ گئی تو اُس نے بھی دو تھی گرجن بچیاں لے کے پالیں۔ اور جوان ہونے پر ان کی نواہان کر دیں۔

اس قسم کی خوش اقبال اگرچہ چند ہی لونڈیوں کو نصیب ہوتی ہے مگر ممالک عثمانیہ کی لونڈیوں کی حالت ارض مغرب (انگلتان فرانس جرمن وغیرہ) کی خادماؤں سے مختلف حیثیتوں سے اچھی ہے۔ لونڈی کے فرائض عام اس سے کہ وہ پیش خدمت

یا کھلائی۔ یا شہر بسلائے والی ہوزیادہ محبت و جفاکشی کے نہیں ہیں۔ اور اسے ملوں کا خواب دیکھتے یا شیخ چنی کے منصوبے گناہنے کی تجویزی فرست لجاتی ہے۔ جب کہ وہ دل ہی دل میں سوچتی ہے کہ کبھی میں بھی خانم ہوں گی۔ لونڈیان میری خدمت کرتی ہوں گی۔ اور اگر خدا نے اسے دولت حسن و سی برکت بھی عطا فرمائی ہو جائے ہیں۔ معزز خاتونین جب گاڑی پر بیٹھ کے ہو اٹھائے کسی دوسری خانم سے ملاقات کرنے باغون میں تفریح کرنے جنگوں کی فضا سے لطف اٹھانے۔ یا حمام میں نہانے کے لئے جاتی ہیں تو گھر کا کام کاج کرنے والی بہت سی لونڈیاں ان کے ہمراہ جاتی اور ان لطفوں میں اپنی بی بی کے ساتھ شریک ہوتی ہیں۔ ہر شریف خانوں کے ساتھ لونڈیوں کی ایک تعداد کثیر کو موجود دیکھنے ہی سے اکثر نادان سیاحان یورپ کو دھوکا ہوا۔ وہ سب کو کسی رئیس یا کسی پاشا کی بیویاں سمجھ گئے۔ اور نقد و ازاد و پیر بخت کرنے لگے۔ حالانکہ وہ سب خانم افندی کی خاوندان اور لونڈیاں ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنے آرام کے لئے یا ان کو خریدار پبلک میں شہرت دینے کے لئے ستا رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ آنے جانے والی خاتونوں اور ہانوں کے سامنے وہ اپنی مالک بی بی کو آگے دست بستہ کھڑی ہوتی اور بڑے ادب سے بات کرتی ہیں لیکن تنہائی میں انہیں بات چیت اور اپنے افعال و حرکات کے متعلق بہت کچھ آزادی حاصل رہتی ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک کم درجہ کا کھانا لونڈی غلاموں کے لئے نذر ہوتا ہے۔ کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ جو خود پہنوں وہی اپنی لونڈی غلام کو پہناؤ اور جو خود کھاؤ وہی لونڈی غلام کو کھلاؤ۔ اس میں چاہے کیسے ہی عیوب ہوں اور کیسے ہی سخت تصور ہو جائیں وہ نکال نہیں دیا جاسکتی ہے کہ گلی کو چون کی ٹھوکرین کھائے اور ہرنال میں مالک اس کے کفایت کا ذمہ داسے۔ متصل سات سال تک خدمت بجالانے کے بعد وہ آزادی کی خواہنگار ہو سکتی ہے۔ اور عموماً اسے آزادی حاصل ہو جاتی ہے جس کے ساتھ ایک جوڑا دیا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ لونڈی غلاموں کو آزاد کرنا دین اسلام میں ایک بہت بڑا دین داری و ثواب کا کام تصور کیا جاتا ہے۔ اور اکثر ترک بستر مرگ پر لیٹنے کے وقت گھر کے تمام لونڈی غلاموں کو اجراء خیر حاصل کرنے کے لئے آزاد کر دیا کرتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی اتفاق پیش آجاتا ہے کہ لوندیان ایسے بے رحم لوگوں کے ہتھوڑے پر جائیں جو سات برس کا زمانہ گزرنے سے پہلے ہی انھیں فروخت کر ڈالیں۔ تاکہ انکی رقم نہ ڈوبے۔ اور خریداری میں جو روپیہ صرف کیا تھا نقد ہو جائے۔ یا ایسے ظالم مالک کے ہاتھ میں مبتلا ہو جائیں جس کا مزاج سخت ہو۔ اور اُن پر بے رحمی سے جبر و تشدد کرتا ہو۔ جیسا کہ دو غریب چھوٹی لڑکیوں کے معاملہ میں پیش آیا۔ ان دونوں میں سے ایک ارض جیش کی تھی اور ایک نیویہ کی جو شاید دو سال بڑی تھی۔ ان کو ایک معزز ترک عہدہ دار ملک افریقہ سے اپنی بیوہ مان کے لئے شہر منتقل کر لایا تھا۔ اُس بیوہ خانم کا سلوک ان دونوں چھو کر یون کے ساتھ ایسا بے رحمانہ تھا کہ پڑوس والوں کو بھی تکلیف ہوتی تھی۔ مگر وہ خاتون دو تہمند اور صاحب اثر تھی جس پر کسی کا کچھ زور نہ چل سکتا۔ آخر ایک دن سخت بے رحمی کی سزا پانے کے بعد دونوں لڑکیاں لوگوں کی آنکھ سے بچا کے محلہ اسے نقل کھڑی ہوئیں۔ اور سیدھی برٹش سفارت خانے میں آئیں۔ سفیر صاحب تو کہیں باہر گئے ہوئے تھے اُن کی سیم صاحب نے ترس کھا کے دو ٹوکوں سے اپنے پاس رکھ لیا۔ چھو کر یان اُن سے واپس طلب کی گئیں تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے صاحب کے آئے بغیر ان کو نہ دوں گی۔ سفیر صاحب چند روز کے بعد گھر میں آئے اور اُن لڑکیوں کو دیکھ کے اُن کی کیفیت بی بی سے سنی تو انگلستان کے محکمہ خارجہ میں پھوٹ کی۔ اور زور کے ساتھ تحریک کی کہ اگر یہ لڑکیاں واپس لوالی گئیں تو بڑا ظلم ہوگا۔ مگر وہ ترکی خانم صاحب بھی بغیر جھگڑا کیے نہ رہیں۔ اور باپٹلی میں اپنی سفارش ہم پہنچا کے ایسا زور ڈالا کہ محکمہ خارجہ انگلستان سے حکم نافذ ہو گیا کہ وہ دونوں چھو کر یان واپس کر دی جائیں۔ سفیر صاحب کو ان دونوں کے حال پر اس قدر ترس آ گیا تھا کہ محکمہ خارجہ کا یہ حکم پاتے ہی انھوں نے اپنی گورنمنٹ کو آوار سے دیا کہ اگر یہ لڑکیاں لوالی گئیں تو بین استغفادے دو لگا۔ مجھ سے نہیں چل سکتا کہ انھیں ظلم جو رکے لئے پھر واپس کر دوں۔ آخر اُن کے استقلال نے پورا اثر کیا۔ معاملہ پر دوبارہ غور کیا گیا۔ اور وہ لڑکیاں آزاد قرار دی گئیں۔ جس کے بعد انھوں نے دین ہیوسوی اختیار کر لیا۔ اور جب بڑی ہوئیں تو ایک کی شادی ایک جرمنی کو ساتھ اور دوسری کی ایک ارمینی کے ساتھ کر دی گئی۔

گر برٹش گورنمنٹ کی دخل دہی سے ایک جگر خراش واقعہ بھی پیش آیا جس سے اکثر لوگوں کو تکلیف ہوئی۔ جن دنوں یہ واقعہ پیش آیا سے اُن دنوں لیڈز میں گارنٹ جن کے بیان سے ہم ان حالات کو اخذ کر رہے ہیں قسطنطنیہ میں موجود تھین بہاولپورہ کی ایک لڑکی نے برٹش سفارت خانے میں آ کے پناہ لی۔ یہ مسئلہ کہ یہ کہاں اور کس طریقہ سے رکھی جائے یوں طے ہو گیا کہ ایک صاحب بہادر نے جو سفارت خانہ کے ملازمین میں تھے اسے کھانا پکانے کی خدمت پر رکھ لیا۔ اتفاقاً ایک ترک جوان جو سنتری تھا اور کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ اس لڑکی سے راہ درسم ہو گئی۔ اور لڑکی اُس پر اس قدر فریفتہ ہو گئی کہ اس سے دست بردار ہو گئے کو کسی طرح گوارا ہی نہ کرتی تھی۔ اور صاحب بہادر اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ ترکوں کے گھر سے بھائی ہوئی لڑکی پھر کسی ترک کے پاس جاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترک جوان جب ایشیا سے کوچک میں اپنے وطن واپس گیا۔ تو اُس کے فراق میں لڑکی اس قدر بیخود ہوئی کہ پھانسی ٹھک کے مر گئی۔

جو کہ جنین باندی گری کے مدارج طے کر چکی ہیں اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ بڑی قوی ہمدردی رکھتی ہیں باتوں باتوں میں چہان کسی اگر جن کو معلوم ہو گیا کہ اُس کی ہم محبت بھی اُس کی طرح اصل میں لونڈی تھی تو فوراً دونوں میں پہنچا ہوا جاتا ہے اور خاص قسم کے قوی تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ کہ جنین اپنے سے کم استطاعت رکھنے والی گرجنوں پر بہت زیادہ فہمی کرتی ہیں۔ مگر ساتھ ہی دوسروں کے ساتھ کسی قسم کا تعصب نہیں۔ غلامی اور گرجستانی الامصل ہونے کے تمام علامات و خیالات دوسری پشت میں جا کے فنا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے بچے عثمانی ترک ہوتے ہیں۔

قدر افزایان دولت از

دولت از کو آپ کی نظر عنایت کے علاوہ دولت آصفیہ خلد اللہ و دلتا کا دامن محافظت میں مل گیا۔ لہذا اب اہتمام و عمل کی سے مسلسل شایع ہوتا رہے گا آپ کی مزید توجہ درکار ہے۔

خاکسار نیمو دولت از



مین الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا مکمل آبا

دگلدار کے اس نمبر میں سب کے پہلے ہم مولوی محمد عبدالحق صاحب لی۔ اے کا ایک مضمون شائع کرتے ہیں جس کی طرٹ اگر توجہ کی جائے تو جدید تاریخ ہند میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ ایک صدی پہلے کے مورخین کا مہمل تھا کہ بغیر اس کے کہ کوئی خاص پالیسی یا غرض پیش نظر ہو واقعات عالم کی تصویر دکھایا کرتے تھے مگر اب ہر تاریخ کوئی اصول پالیسی اور غرض پیش نظر رکھ کے لکھی جاتی ہے۔ اور اس کی برکت یہ ہے کہ ہر قوم دوسری قوم سے دست دگر بیان ہونے کو تیار ہے۔

مسلمان سلاطین برے ہون یا بھلے پرانی تاریخوں کے دیکھنے سے اپنی اصلی صورت میں نظر آسکتے ہیں۔ مگر ان پھیلی تاریخوں میں وہ ایک پرستی تھیٹر کے کیمرہ میں بنائے جاتے ہیں۔ کوئی لائڈ بوب دکھایا جاتا ہے کوئی متعصب۔ کوئی ظالم بتایا جاتا ہے اور کوئی بت شکن۔ یہ آخری فقط ہندوؤں کے لئے نہایت ہی غیر قابل برداشت ہے۔ وہ خود آریہ سماج ہو کے چاہیں بت شکنی کریں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن کسی مسلمان کے ہاتھ سے اگر کوئی بت ٹوٹ جائے تو یہ چھنا چاہئے کہ ہندوؤں ہی کی نہیں ساری آریہ قوم کی توہین ہو گئی۔ اور خرابی یہ کہ انھیں اپنی دوسری تاریخوں میں سارے مسلمان بادشاہ (سوا وہ ایک کے جو لائڈ بوب ہو گئے تھے) سب کے سب بت شکن نظر آتے ہیں اور کسی قوم کی پگمناہ کبھی نہیں سزد ہوا۔ اور سب مسلمان فرمان روا ایک طرٹ اور اکیلا اور رنگ زیب ایک طرٹ۔ کیونکہ اور رنگ زیب لے اتے بہت توڑ ڈالے کہ ہندوستان کا کوئی بت خانہ

اُس کے دست ستم سے نہیں بچ سکا۔ اُس کماری سے ہمالیہ تک اور اراکان سے افغانستان تک جتنے بت خالے مسجد بنے سب اُسی کے بنائے ہوئے ہیں اور جتنے ٹوٹے پھوٹے ثبت ملین سب اُسی کے ٹوڑے ہوئے ہیں۔

ناوک لے اسکے حیدر چھوڑا زامین تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانی زمین اور نگ زیب کے متعلق اگرچہ کسی پرائی کتاب سے ان باتوں کا ثبوت نہ ملے گا۔ گواگلے متعصب غیر مذہب واسطے بھی اُس کی انصاف پروری کی ترقیت کرتے ہوں۔ گوہر سال وہ مسلمان امرا کی طرح صد ہا چھوڑا کو بھی خلعت سرفرازی دیتا ہو رگو خاص بنارس کے مندر وں تک کو اُس نے جاگیر دی ہوں۔ اور اس کے شاہی خزانہ تک موجود ہوں گو اور نگ آباد کے گرد پیش کے اراضی معروضہ اُس نے ہندو راجاؤں کو دے رکھے ہوں تم ان سب باتوں کو جھوٹ جاؤ۔ اور وہی مانو جو مسلمانوں اور ان کے پیرو مورخوں نے تم کو بتا دیا ہے۔

لیکن زمین یہ جادو چلتا نہیں نظر آتا۔ اور یہ طلسم لٹا دکانی دیتا ہے۔ کہیں کہ مولیٰ عبدالحق صاحب نے ایک ایسے عجیب و غریب اقبالی مجرم کو پکڑ پایا ہے کہ ”کرے موبھون والا اور پکڑا جائے ڈاڑھی والا“ کی مثل پوری پوری صادق آتی ہے۔ اب معلوم ہو کہ بیچارہ اور نگ زیب مفت میں بدنام کیا گیا یہ سارے تہکھنڈے ایک مقدس و محترم پادری صاحب کے ہیں جو لوگوں کی آنکھیں پچا کے جہان کی صورت نظر آتی تو ڈھالنے تھے۔ کیا عجب کہ بت خانوں کے یہ تمام سنگین شہداء اٹھیں بزرگ کی مہربانیوں کی یادگار ہوں۔ آپ اپنا کام کر کے چلتے بنے۔ اور مفت میں بدنام ہوا بیچارہ عالمگیر۔

شمس العلماء مولانا شبلی نے اور نگ زیب کی حمایت میں ایک محققانہ مضمون کئی نمبروں میں تقسیم کر کے رسالہ ”اندھین شائع کر لیا ہے۔ لیکن جب تک ان پادری صاحب کا ذکر غیر اُس میں نہ آئے گا ہمارے نزدیک اُس کا ٹک پھیکا رہے گا۔

بہر حال ہم مولیٰ عبدالحق صاحب کی اس جستجو کے شکر گزار ہیں۔ شکر گزار تو ہندوؤں کو بھی ہونا چاہئے۔ مگر ہمارے خیال میں ایسی باتوں کے ماننے کے لئے انہیں بڑی زیادہ تجربہ کی ضرورت ہے۔ اب اس تمہید کو ختم کر کہ ہم اس مضمون کو پبلک کورسائیٹیشن کرتے ہیں۔

ایک بت شکن یورپین

کچھ اوپر دوسو برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ ایک اٹالین ڈاکٹر گیمیلی گریزی نامی بزنس
سیر و سیاحت ہندوستان میں پہنچا۔ اگرچہ اُس کا یہاں آنا خاندانی بھگڑون کی وجہ سے
ہوا لیکن سفر کا شوق اُسے پہلے سے تھا۔ یہ چنانچہ ۱۷۸۵ء میں یورپ کا سفر چکا تھا۔
ہندوستان میں وہ ۱۲ جون ۱۷۸۵ء کو پہنچا اور ۳۰ دسمبر ۱۷۹۹ء تک یہاں کی سیر کی اور
بعد ازاں دنیا بھر کا چکر لگایا۔ مغرب و مصر، فلسطین، روم و ایران سے ہوتا ہوا ہندو
میں داخل ہوا۔ اصفہان میں اُسے شاہی دربار میں بھی باریاب ہونے کا موقع ملا اور
وہاں اس نے علاوہ دیگر سفرائے غیر ممالک کے شہنشاہ اورنگ زیب کے بیٹے محمد اکبر
کو بھی دیکھا جس نے بھاگ کر شاہ ایران کے دربار میں پناہ لی تھی۔ ہندوستان میں
اگر کچھ دیر ان پرتگیزیوں کے علاقہ گوا میں رہا۔ اور اس کے بعد اُس نے اندرونی ممالک
کا سفر شروع کیا۔ اُس کا یہ سفر تاریخی لحاظ سے بھی بہت دلچسپ ہے۔ ۵ مارچ ۱۷۹۳ء
کو وہ گوا سے اس نیت سے روانہ ہوا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں حضور
کی عزت حاصل کرے۔ شہنشاہ اُس وقت مولشکر کے گلگامین خیمہ زن تھے۔ اس
سفر میں اُس نے رستہ کی تکلیف اور بار بار داری کی شکایت کی ہے لیکن ساتھ ہی اس
امر کا اعتراف کیا ہے کہ یہ تکلیف صرف بیجا پور کے نواح میں ہے ”جو آجکل عرصہ
جنگ و جدل بنا ہوا ہے لیکن سلطنت کے شمالی حصوں میں احمد آباد اور سورت
کے قریب راستے بہت گہراں ہیں جہاں کسی قسم کا خوف و اندیشہ نہیں ہے۔ جب ہم
یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے جانے کے بعد جب وہ سفر یورپ میں مصروف
تھا جاسوس کچھ کر قید کر لیا گیا اور اُس کی عمر کے آخری دن قہر میں گذرے۔ تو اس کا
بہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیسا پلین تھا کہ غیر ممالک
کے لوگ بلا خوف و خطر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیر و سیاحت کر سکتے
تھے۔ راستہ میں اُس نے ایک عورت کو سستی ہوتے بھی دیکھا اور اس کی پوری کیفیت
اُس نے اپنے سفر نامے میں بیان کی ہے۔ اور جو تکلیفیں راستہ میں اُسے پہنچیں وہ
تو خیر بہت کم ہیں۔ لیکن رستہ بھر بڑا اندیشہ اس کے دل کو لگا ہوا تھا کہ کچھ اور ہی تھا

بات یہ ہے کہ ہندوستان میں پہنچ کر آپ کو ایک نئی ٹوہن سانی تھی وہ یہ تھی کہ جہاں کہیں راستہ میں کوئی بت نظر آیا آپ فوراً اس پر دست شفقت پھیر دیتے تھے۔ اور جہاں دیکھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں اور موقع نہیں ہے وہاں تاک میں رہتے اور آنکھ بچا اپنا کام کر چلتے پھرتے نظر آتے اور یہی وجہ ہے کہ ساری لاپرواہی اور لگاؤ ہا کہ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو جان پر آسنے لگی۔ مگر باوجود اس کے وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتے تھے۔ اور محض فیض حصول ثواب یہ کام خود کر گزرتی تھیں حالانکہ آپ ڈاکٹر آف سول لاء تھے۔ اور جب گواپینے میں ہو گوا گورنمنٹ نے کچھ بہت غنیمت جانا اور ایک بیش متداخذاہ دے کر چاہا کہ انہیں اپنے ہاں رکھ لے مگر انہوں نے منظور نہ کیا۔ اگر خدا تعالیٰ اسے وہ گوا میں رہ جاتے تو شاید دکر کا کوئی بت اُن کے ہاتھ سے صبح سالم نہ پہنچتا۔

اور رنگ زیب کے مستخرجین نے جہاں اس پر اور بہت سے الزامات لگائے کہ میں وہاں ایک بت شکنی کا الزام بھی ہے۔ اگرچہ کوئی تاریخی ثبوت بیش نہیں کیا گیا۔ اور رنگ زیب کے کیریکٹر اور مصالح کے سمجھنے میں لوگوں نے بہت کچھ غلطی کی ہے اور خصوصاً یورپین مورخوں نے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ وہ رنگ سب پر غالب آ گیا ہے اور اُن کی بہت سی ادائیں مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر نظر حقیقی سے دیکھا جائے تو اُن کی کوئی بنیاد نہیں معلوم ہوتی ہے۔ وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ظاہر کی جائے گی اور جھوٹی رنگ آمیزیاں سب زائل ہو جائیں گی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ خاص اور رنگ زیب کے زمانے میں ایک یورپین اور وہ بھی رومن کی تھلک اور پھر ڈاکٹر آف سول لاء در دراز کے ملک سے سفر کر کے ہندوستان آئے گا۔ اور بلا وجہ اور کسی اشتعال کے بت شکنی کرے گا۔ اب ہم اُسی کی زبانی اور گتہ کی بے نقبھی کا حال منداستہ میں۔ حالانکہ یہ شخص مسلمانوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ غرض وہ مارچ کو منزل مقصود پر پہنچا۔ اور اُن عیسائیوں نے جو اور رنگ زیب کی فوج میں ملازم تھے اس کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا اور انہوں نے اس سے بیان کیا کہ اس بادشاہ کی ملازمت میں حقیقی مسرت

اور لطف حاصل ہوتا ہے اور کوئی بادشاہ اپنے سپاہی کو اتنی تنخواہ نہیں دیتا جتنی یہ دیتا ہے۔ اگر وہ کسی روز نہ لڑیں یا اپنا فرض ادا نہ کریں تو جرمانہ میں صرف اسی روز کی تنخواہ وضع ہو جاتی ہے اور بس۔ اور انکے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوتی۔ لوح میں وہ کچھ عیسائیوں کا ایک گرجا بھی تھا جس میں دو کینری بادی مذہبی رسوم کے ادا کرنے پر ملازم تھے۔ گیمیلی نے ایک ہی واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ دو مسلمان شراب پینے کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور عیسائی کپتان کے حکم سے انہیں دڑے نگائے گئے۔ اور ان مسلمان ملازموں نے اس بجا اور معقول سزا کا شکریہ ادا کیا۔ جب اورنگ زیب عیسائیوں کے ساتھ اس طرح بے تعصبی کے ساتھ پیش آتا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ تعصب برتتا اور مذہب کے خیال سے ان پر ظلم کرتا۔

عبداللہ

صبح بہار

سوحن نکلتے ہیں سونا زبر سے ہین

اے صل علی تجہ میں کیا شان نکلتی ہے

یوں تو صبح عمر باجان فرا اور فرحت بخش ہو ا کرتی ہے مگر صبح بہار کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے اور اُس کی شان لہجہ ہی صبح سے نہرا رنگ نہری ہوتی ہے۔ جس نے یہ صبح دیکھی ہے بس اسی کے دل سے اُس کا زالا جو بن ادا ہو چکے۔

ہائے کیا پیار پیار اسہا نا وقت ہوتا ہے اور کس غضب کا دلچسپ و دلکش منظر؟ وہ سر بستہ اور بے دہن کلیان اور منہ بند خنجر اور رات بھر دلی القباض کی وجہ سے بضمیل اور افسردہ خاطر ہو گئے تھے صبح بہار کی یہ جان کشی دیکھتے ہی سکر ائے اور نسیم بہار کے پہلو میں ٹھو کے دینے اور بار بار گدگدائے سے آخر کار بے اختیار ہو کر کھلکھلا کر سہنس پڑے۔ وہ کھلے ہوئے لوزخیر پھول جو تمام رات بے کسی و کس پریشی کے عالم میں بڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے صبح بہار کی خوش آئند صورت دیکھتے ہی سر اٹھائے گئے اور اپنی دل فریب و تروتازگی اور نظر فریب نہایت و شادابی سے ایک عالم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ خوابیدہ سبز چہرہ انت کہ اس بچہ گئی تھی صبح بہار کی کرم زبانی سے اس وقت جھوم جھوم کہ لہرا رہا ہے اور بڑے مزے کے عالم میں ہے۔

خوش نوابل کے انداز سے اس وقت عجب سستی و خود فراموشی کی نشان دہی کرتی ہے ہائے سہیل کی بہار میں نہ پوچھو نہ منہ چومتی ہے کلی کلی کا۔

ہی قد سرو اس وقت کا خوش گوار منظر دیکھ دیکھ کر صورت تصویر حیران کھڑا ہے اور کبھی کبھار بولتا بھی ہے تو اپنی عاشق صادق قمری کی زبان سے جو اسی صبح بہار کی تلاش و جستجو میں ہر وقت کو کو کی آواز لگایا کرتی ہے۔ نغمہ سنج طیور اور رنگین ادب پرند یہاں کی فضا کے گرد آگے مچ ہوئے ہیں اور اپنی ترانہ سنجی و خوش آواز سے اہل عالم کا دل سرور کر رہے ہیں۔ شاہد باغ (سور) بھی یہاں کی یہ نگر نطف کیفیت اور دلچسپ سامان مشاہدہ کر کے بچا ایسے وجد و سرور کی حالت میں آگیا ہے کہ بے خود اور متوالا ہو کر ناچ رہا ہے اور اس کے دل و دماغ پر عجیب محبت و انبساط کا عالم طاری ہے۔

رنگس جیہا جو صرف رات بھر کے لئے یہاں آئے تھے اب انہیں اپنی اس گھڑی اپنے گھر دے دی خوش کن منظر کو بڑی آرزو اور اشتیاق کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے اور اس وقت کے سین کی دہیسی کچھ ایسی بڑھی ہوئی ہے کہ اس کا شوق دیدار کسی طرح کم ہی نہیں ہوتا اور یہ برابر فلکی باندیت سے گھور رہی ہے۔ خدا جو انسان چین اور نوحہ و سمان باغ کو اس وقت نظر بد سے بچائے جن پر بلا کا جو بن پھٹ پڑا ہے اور انکی سادگی اور خود دہی میں ایک عجیب حسن پیدا ہے۔

سوسن جس کی زبان درازیاں مشہور عالم میں اس کی زبان بھی اس وقت کر و روح انرا منظر اور خوش گوار دلچسپیوں کو دیکھ کر بندھی ہو گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ صبح بہار کی کرشمہ سازی نے تھوڑی دیر کے لئے اس کی قوت گویائی چھین کر اس کی منہ پھٹ زبان پر لگام چڑا دی ہے جس سے یہ دیکھنے کے سوا کسی سے بات کرنے کے قابل یا اس کی زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ ملا حیان سنانے کے لائق نہیں رہی اور اس پر ہلکے تگے یہ دم نہ کشیدم کی پُرانی نثر پوری طرح صادق آئی۔

قدرت کا یہ انتظام بھی بے وجہ نہیں معلوم ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ ایسے پُر فضا وقت اور سہاگے سمان میں اس کی زبان درازیاں اور سرگوشیاں ہمارے غصے کو بہت کچھ کر کر کے والی نکھری ہوئی اچھوتی صحبت میں خلل انداز ہونے والی اور رومی انبساط و وقتی لطف کو بڑی حد تک بے کیف بنا دینے والی ثابت ہوتی ہیں اور

صبح بہار جو مجموعی طور پر بے عیب واقع ہوئی ہے اس بدنامیب سے خالی نہ رہ سکتی۔
لالہ خوشترنگ جس کے دل میں خدا جانے کس قدر مدت سے دلچسپی اور یہ بھی
خبر نہیں کہ کس ماہ دش کی فرقت کا داغ ہے رات بھر اس داغ کی بدولت بے چین و
پریشان رہا کرتا ہے مگر واللہ اعلم کیا سبب ہے کہ صبح بہار کے رونما ہوتے ہی
اس کے داغ میں کچھ ایسی ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے کہ یہ بھی اپنے محبوبوں سے رہنے
بولنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور اسکی لال لال شاداب صورت دیکھنے سے ایسا
ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت نے صبح بہار کا جلوہ اس کو نہیں دکھایا بلکہ اس کے داغ دل
پر مرہم کا فور رکھ دیا۔ غرض نوجوانان کلشن پر صبح بہار کی معجز نمانی و جادو اثری سے
ایک نور کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ سوطح کے سخن مٹنے لگتے اور ہزار قسم کے
ناز برسنے لگ جاتے ہیں جن کا لطف اور کیفیت بس مشاہدہ کرنے اور دیکھنے ہی
معلوم ہو سکتے ہیں۔ فلم میں اس قدر قدرت نہیں کہ اس کا معمولی سا نقشہ بھی مسح
پیمانہ پر کھینچ سکے۔

صبح بہار کا یہ کرشمہ اور اعجاز آپ غیر ذی روح اجسام پر تو ملاحظہ فرما چکے اب
ذی روح اجسام پر اس کی تاثیرات کی تصویریں دیکھئے۔ دیکھئے ایک مدقون کا
بیمار اور وہ بھی یوس العلان سر جھکائے ٹنگن بیٹھا ہے اور اپنی تکلیفوں اور ناقابل
برداشت معوجتوں کا خیال کر کر کے بار بار ارادہ کرتا ہے کہ اس الجھن سے نجات
پانے کے لئے خودکشی کر لے اور اس مصیبت بھری زندگی پر موت کو ترجیح دے۔
یہ ابھی اسی خیال میں سرگردان و پریشان تھا کہ نور کا ٹکڑا ہوا اور صبح بہار نے اپنا
پُر لطف و مسرت خیر جلوہ اس کی اشک حسرت سے بھری ہوئی آنکھوں کو دکھا دیا۔
بس پھر کیا تھا ایک جادو تھا جو آنکھوں کے ذریعہ سے دل تک اتر گیا اور اس یوس
بیمار کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے "اہ کیا ہی اچھی اور دل آویز صبح ہے جس کے
پُر نور جلوہ کو دیکھتے ہی میری آنکھیں خوشی اور مسرت سے چمکنے لگیں اور میرے
قلب غیر مطمئن کو ایک ڈھانسی سی بندھ گئی۔ کیا عجب ہے کہ اسی صبح کی جانفزائی -
روح بخشی اور ن پروردی پھر مجھے اسی حالت پر آئے جیسا کہ میں پہلے کبھی تھا"
اس حوصلہ افزا اور فرحت بخش خیال کا دل میں جاگزیں ہونا تھا کہ اتنے ایک مرتبہ

یہ ایک اس امر کا احساس ہوا کہ میرے ناتوان بدن اور نحیف جسم میں قوت و توانائی
از سر نو نمود کر آئی اور یہ اپنے تئیں اب اُس حالت میں پاتا ہے کہ گویا کبھی بیمار ہی
نہیں تھا۔ ان خوشگوار خیالات کا اثر اُس کے دل و دماغ پر رفتہ رفتہ اس قدر قوی
گہرا اور دیر پا پڑتا ہے کہ اُسے اپنے جینے کی پوری آس ہو جاتی ہے اور تھوڑے
دن بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اچھا خاصہ تندرست آدمیوں کی طرح بازار و دن اور تفریح
گاہوں میں چل پھر رہا ہے۔ صبح بہار کی مسحافتی اور معجزانہائی اس سے زیادہ اور کیا
ہو سکتی ہے؟

اُن بد نصیب عشاق کی طرف دیکھئے جنہوں نے شب ہجر آخر شمار کی کر کے
کیسی کسی دعا میں مانگ کر کتنی کتنی منتیں مان کر اور خدا جانے کس قدر کڑی
بے بیتین اور سخت تکلیفیں اٹھانے کے بعد صبح کی خوش آئند اور دل فریب صورت دیکھی
ہے اور دیکھتے ہی تمام رات کی کھفتیں کاوشین اور ہجران نصیبی کی اذیتیں یکلاخت
بھول گئے ہیں اور اُن کے بڑے مردہ چہرہ دن پر گردِ مال کی بجائے شادمانی و انبساط
کا سُرخ و سپید پوڈر نظر آ رہا ہے اور باری المنظومین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح بہار
کی دغہ بھری درعنائی۔ رفت کی دلچسپی اور موسم کی خوبی و دلربائی نے اپنے وجد و انگیز
سناظرِ ادبی طعنے نیز سیرِ بیان دکھا دکھا کر آخر شایان کے دل کی مریضی ہوئی کلی کھلا دی
ہے اور یہ ابی گشتِ فنا کو سرسبز ہوتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہے ہیں۔
اور غور سے ان کی صورت دیکھنے پر صاف نظر آتا ہے کہ کس موصن کر تی تہوئی ہونٹوں
پہنسی بھرتی ہے۔ بے باغ کبھی آتا ہے تو زردیدہ بسم ان کو۔

صبح وصال کو عاشقِ فزاج اور غنیمتہ جگر لوگ چاہے کتنا ہی بُرا بتائیں مگر اس میں
ذرا شبہ نہیں کہ صبحِ شب ہجران کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور اگر شب ہجر
کے بعد صبح نمودار نہ ہو تو بالبد اہت مان لینا چاہئے کہ یہ گھڑی بھر بھی نہجی سکین اور
ایسی حالت میں بلا مبالغہ عرصہ دنیا ان کے لئے تنگ و نار یک ہو جائے اور ہمیشہ
کے لئے رہے لہذا اسے عشق کے متوالوں اور حرمانِ نصیب عاشقوں پر صبح کا
بہت بڑا احسان ہو اور وہ اس احسانِ مندی سے تمام عمر بیکدوش نہیں ہو سکتے۔ جب
معمولی صبح کو یہ اس قدر شرمندہ احسان اور گرویدہ دلکشی و شہرت بخشی ہیں تو صبح بہار

کا ان کو نسبت زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیے گو زبان سے یہ اسکا انوار نہ کریں اور زمانہ کو کوستے اور فلکس کو بڑا بھلا کہتے رہیں مگر ہم ان کے دل کی حالتوں کو خوب جانتے ہیں۔ چاہے یہ اپنے غم سے اس غمگنہ اری کا اظہار نہ کریں مگر اسے صبح بہار سچے اسکی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہئے کیونکہ ان کے چشم و ابرو اشارے کر رہے ہیں کہ ہم تیرے شرمندہ احسان اور گردیدہ کر مغرمانی ہیں۔

ستے ہیں اور معتبر ذرائع سے سنتے ہیں۔ غیر ہے اور منقول خبر ہے کہ حضرت رب العزت نے جنت والوں کی دلچسپی و فرحت کے لئے صبح ہی کا وقت پسند فرمایا جو اور گو میاں ہے مگر صبح قیاس کہ یہ صبح بھی بہار کی سی دلیری و نظریہ بھی لئے ہوئے ہوگی بلکہ اعتقاد آہمین اس سے بھی زیادہ بھاری دلچسپی کی امید وائق رکھتی چاہئے ناز آفرین مہر جینوں اور ملائک فریب پری جالوں نے اپنی نگاشت باغ اور سیر و تفریح کا یہی پرتور۔ سہانا اور مست و بے خود کر دینے والا وقت تجویز کر کے خدا کی سنت ادا کی ہے اور نموش رفتار منہنوں نے بھی اسی نورِ نعلیور کے وقت اپنی مشانہ روش اور دریا بایانہ خرام ناد کا تماشا دکھلا دکھلا کر جو روش حسینوں کے سخت اور پتھر دل کو مسخّر اور نرم کر لیا ہے۔

پس صبح بہار جس میں ایسی دلچسپیاں ہیں۔ اس قدر روحانی مسرتیں ہیں۔ اس طرح کی وجدانی کیفیتیں ہیں جسکو پری پیکر نازنین اسقدر شوق و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جسکو خود خداوند جل و علانے بھی ہمارے ہی لئے پسند فرمایا ہے ہم کو اس قدر عزیز کیونکہ نہ ہو اور ہم اس کے قدرتی دلچسپ مناظر دیکھ کر از خود رفتہ و محو کس لئے نہ ہو جائیں؟ اسے صبح بہار! تو ہمارے لئے ہے اور ہم تیرے لئے پسند اچھب بیک اس دنیا میں ہیں تجھ سے سلف اٹھائیں گے اور جب اس عالم میں ہوں گے (جہاں تو بھی دائمی طور پر موجود ہوگی) وہاں بھی تیرے دلکش سین دیکھ دیکھ کر خوش اور سرور ہو یا کریں گے۔

(سید نظام الدین شاہ دگلیر اکبر آبادی)

ترکان آل عثمان

در چند ہشتون کا معاملہ البتہ اور طرح کا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ایک جداگانہ قوم بنی
 رومی ہیں۔ اور اکثر اوقات انکس و مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ مگر عام طور پر دیکھا جاتی
 تو ان کی اس ہستی کا الزام خود انہیں پر ہے۔ اس لئے کہ ان خون لئے کچھ ایسی غیر عادت
 یا برائیاں نہ مرثت پاتی ہے کہ آزاد ہونے اور بیاہ دئے جانے کے بعد عموماً
 شہرہوں سے لڑھکے کے مفارقت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور یہی زندگی کی آپسی کھیل
 ان کے لئے گونے لڑیا اور کوئی ادنیٰ چیز سر کون پہنچتی پھرتی ہیں۔ جس حد شہر میں وہ
 رہتے ہیں نہایت ہی ہلکا اور ختمہ زخواب ہے جس میں صرف فلکات زدہ اور شکست
 جانی و گسائی آباد ہیں۔ ترکوں کے اس ملک پر قابض ہوتے وقت کے بعد سے
 ہر کسک ہزاروں لاکھوں حبشیوں کے لئے جانے کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ اصلی
 باشندوں اور حبشیوں کے میل سے گورے اور کالے رنگ کا عظیم الشان اتہراج
 ہو گیا ہو گا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اگرچہ حبشوں کی کبھی حبشیوں کے ساتھ اور کبھی گوری
 قوم کے لوگوں کے ساتھ اکثر شادیان ہو جاتی ہیں مگر یہ سر زمین سالوں کی رنگت کے
 لئے موزوں و مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے متضاد میل سے چونکہ بچہ پیدا ہوتا ہے
 عموماً بچہ کن ہی میں مر جاتے ہیں۔ اور کوئی ایسی قوم نہیں پیدا ہو پاتی جو دونوں کا مجموعہ ہو۔
 مولک عثمانیہ کی حبشین اگرچہ کم تر ہیں اور سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں مگر
 ان میں بجائے خود ایک بیہ وقار ہے جس کی بدولت ایک سوسائٹی پیدا ہو گئی ہے اور وہ
 صرف اتنا ہی نہیں کرتی کہ حبشی غلاموں اور حبش نوٹوں کو ظالم ملکوں کے دست و پم
 سے چھڑائے بلکہ بیماری دیکھی اور مرے جینے میں بھی قوم کے کام آتی ہے۔ یہ حبشی سوسائٹی
 ان کے قوی اتحاد کا ایک ذریعہ بن گئی ہے۔ اور بعض اپنے وطنی رسوم کو باوجودیکہ
 وہ مسلمان ہونے کے بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔ اس سوسائٹی کے ماتحت مختلف لاج
 (مصلحتیں) ہیں اور پھیل کی سردار ایک حبش ہے جو کول باشی کے لقب سے یاد کی جاتی ہے
 کول باشی صرف میر مجلس ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک دیوتا کی پوجا رن بھی خیال کی جاتی ہے
 جسے یہ دولت عثمانیہ کے حبشی یورپ کہتے ہیں۔ یہ دیوتا ٹھکانے کے طریقہ پر

وقتاً قتا گول باشی جشن کے سر پر آتا ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس وقت وہ اس بینا رجولیت کی شان پیدا کر دیتا ہے۔

ان میٹھکون کے موقعوں پر گول باشی اپنی محفل کے تمام شرکا کو رنمون میں شریک ہونے کے لئے بلاتی ہے اور سب آ کے یورودہ دیوتا کے سامنے ادب سے بیٹھتے ہیں۔ گول باشی کی نہایت ہی تنظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ اور کسیکو اس کو حکم سے اخراج و نکالت کرنے کی برأت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سب ڈرتے ہیں کہ دیوتا یورودہ سخت سزا دے گا۔ یورودہ صاحب کامہول ہے کہ گول باشی کے سر پر آ کے اور اُسے مرد بنا کے شریک محفل جشنوں میں سے جس جس کو چاہتے اور پسند فرماتے ہیں اپنی دلہن قرار دینے کی عزت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ اور یورودہ کی دلہن بننے کا شوق جشنوں میں اس قدر بڑا ہوا ہے کہ مجال کیا کہ کوئی اس رسم کی محبت ناغہ ہونے پائے۔ تمام جشنیں بغیر اس کے کہ اپنے مالک سے اجازت کی درخواست کریں اور اجازت پائیں جو لے اور دیکھیں کو چرلھے میں جھونک کے اپنے اچھے اور بھڑکیلے کپڑے پہنی اور اپنا پرایا جو کچھ ہاتھ لگالے کے یورودہ کے مندر کی راہ لیتی ہیں۔ گول باشی کا کردار ج کے حملہ عروسی بنایا جاتا ہے۔ بچھونے پر مثال اور دیگر انعام کے قیمتی کپڑے بچھائے جاتے ہیں۔ اُس کا سرا اور سینہ جو ہر استاد طلائی سکون سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ تب وہ جا کے بچھونے پر لیٹ جاتی ہے اور زور و شور سے طبل اور دائری بکنا شروع ہوتے ہیں۔ ٹھوڑی دیر کے بعد وہ پڑے ہی پڑے پیچ و تاب کھانے لگتی ہے اور تشیج شروع ہو جاتا ہے۔ اُس وقت سمجھا جاتا ہے کہ یورودہ آگئے۔ بہت سی عقیدت مند عورتوں پر بھی اُس کے ساتھ عالم بدھو شی و بے خودی طاری ہو جاتا ہے۔ اور اُس بے خودی کے عالم میں وہ سنتی ہیں کہ یورودہ ان سب عورتوں کو نام لے لے کے پکار رہا ہے جنہیں اُس نے اپنی دلہن بنانے کی عزت دی ہے۔ جب یہ جوش و خروش اور تشیج ذرا کم ہوتا ہے تو شربت کے جام گردش میں لائے جاتے ہیں پھر سب ایک نہایت ہی پر تکلف دسترخوان پر بیٹھ کے عمدہ غذا کھاتے ہیں۔ یورودہ کی یہ بیٹھک صرف عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مرد اُس کی کسی رسم میں نہیں شریک۔

کئے جھاسے۔ اگرچہ اس انجمن کے سرمایہ سے مردوں کی مدد ضرور کی جاتی ہے مگر کول ہاشمی جیب باہر نکلتی ہے بھاری اور بڑے تکلف کپڑے پہنے ہوتی ہے۔ کسی خادماہن ساتھ ہوتی ہیں۔ جو نہایت ہی جوش عقیدت سے اُس کے احکام بجا لاتی ہیں۔ دنیوی حیثیت سے بھی اُسے بہت کچھ حکومت حاصل ہے۔ کیونکہ معینہ رقبہ اقتدار کے اندر جو رسم اور راج سے قرار پا جاتا ہے اپنے گروہ میں سے وہ جسے چاہے اُس کی جائداد سے محروم کر سکتی ہے۔ اُسے اپنی زندگی بھر اپنے مکان سکوندار اُن جواہرات و زیور پر جسے پہنا کرتی ہے اختیار حاصل ہے۔ اپنے گروہ کے سرمایہ کا انتظام اُس کے اختیار میں ہے۔ یہ سرمایہ اکثر نقد کی صورت میں اور کبھی مختلف اشیاء کی حیثیت میں چند محکم کے طور پر تقوڑا ہوا کر کے جمع ہوتا ہے۔ اور محبت قاعدے اور پابندی کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی اُس کا کام ہے کہ جو غلام برے اور بے رحم لوگوں کے ہاتھ میں مبتلا ہوں انکو زبردستی ادا کر کے آزادی دلانے۔ آزاد شدہ جہنشین اگر بیمار ہوں یا ذریعہ معیشت نہ رکھتی ہوں تو اُن کو اپنے پاس رکھ کے کھلائے۔ اسی کے نتیجہ میں یہ عام دستور پڑ گیا ہے کہ جن لوگوں کو کسی مایا خدہ شکارنی کی ضرورت ہوتی ہے وہ آزاد شدہ جہنشین کی تلاش میں اسی کول ہاشمی کے پاس آتے ہیں جو ابھی خادماہنین فراہم کر دیا کرتی ہے۔

ترکان آل عثمان کی نسبت مسیولامارٹن نے بہت ٹھیک بتایا ہے کہ شاندار مقامات۔ لہراتے ہوئے سمندر وں۔ سایہ دار گنجوں۔ خنک چشموں۔ اور وسیع خنداؤں کے جن کے چاروں طرف برستانی پہاڑوں کا سفید حلقہ ہو۔ وہ نہایت ہی رسیاہیں۔ عمدہ سینر یوں کے شوق ہی کا سبب ہے کہ ٹرک لوگ جس جگہ جا کے آباد ہوتے ہیں وہاں کے دلچسپ مناظر وں اور ایسے بلند مقاموں کو جہاں بے مثل اور لا جواب سینریان چٹن نظر ہوں انھوں نے اپنی بسنے کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ علاوہ اُن

مردوروں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے ہندوستان کے شیخ سعد و ابدا علیہ السلام تعلقہ کے جہنشین کی اس رسم کو تولیدی کارنت نے اُن کے وطن کی اور اسلام قبول کرنے میں پیشہ کی حکم قرار دیا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے یہاں جو جہنشین ہو اگر قیہن اُن کی اصلیت کیا جانی جائے گی تاہم مسلمان کو شہر آنا چاہئے کہ ایک مسجد خاؤن کو بھی یہ رسم اسلام کے خلاف اور کفر و شرک کی یادگار نظر آتی۔

سات پہاڑیوں کے جن پر شہر رومہ الکبریٰ کی طرح اقبول آباد ہے اُنھوں نے
 باسفورس اور بجریکین کے کنارے کنارے بہت سے خوبصورت اور دلکش مقامات
 کو رہنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ شہر سمرنا میں وہ کوہ پیگیوس کے ڈھال پر
 پرانی شہر کی منہدم دیواروں کے پتے بے ہوئے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے
 جہاں عیسائیوں کا سینٹ پولی کا رب شہید ہوا تھا۔ اور مختلف حملہ آوروں نے
 بے شمار محاصرے کئے تھے۔ اور بڑی بڑی معرکہ آرا بیٹیاں جو چلبلی میں۔ شہر سلونگا
 میں ترکوں کی آبادی اُس نئی سرک سے جسے مدحت پاشا نے نکالا تھا۔ اور اُنھیں
 کے نام سے مشہور ہے شمالی حصہ شہر پناہ اور سات برجوں والے قلعہ تک جو
 ستلہ کوہ پر چڑھ چکا ہے۔ سرکین جن میں سے اکثر سچے نہیں بنائی گئی ہیں اور
 بہت ہی ٹیڑھی اور ادبھی چنی ہیں اُن کی یہ حالت ہے کہ خشکی کے موسم میں تو ٹخنوں
 تک پاؤں بالو میں غائب ہو جاتا ہے اور برسات میں اُن کی بیچ میں پانی کا دھارا
 بہنے لگتا ہے۔ لیکن مرک کے علاوہ دیگر جیٹھوئے انکی آبادی مقابل ہو و درضاری
 کے محلوں کے زیادہ صاف اور ستہری ہے۔ کیونکہ اُن کے محلوں میں صفائی
 کی خدمت بجالانے والے کتے موجود ہیں جن کی داشت اور بردش مسلمان
 ہی کرتے ہیں۔ نیز اس سبب سے کہ اُن کے باغوں اور عام محلوں کا ایک
 حصہ کوڑے وغیرہ کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔

یہاں ہر مکان میں عام اس سے کہ غریب سے غریب ترک کا ہو اگر اُس میں
 بلغ نہ بھی ہو تو ایک صحن ضرور ہوتا ہے اور اُس کے گرد ہمیشہ شہتوت یا بول کر
 سدا بہار درختوں کی قطا ہوتی ہے۔ نیز ہر مکان دوسرے سے بالکل جدا
 ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اُن کی آبادی پاشان اور نشتہ ہے اور زیادہ حدی نہیں
 کوئے ہوئے ہے۔ اہل حرفہ اور مزدوری پیشہ ترکوں کے مکانات بھی دیگر اقوام
 کے کاریگروں اور مزدوروں کے مکانات سے علی العموم متماثر ہوتے ہیں۔ اور
 اُن کی خاص پہچان یہ ہے کہ دوسرے چھپر ہوتے ہیں جن میں مرک کی جانب کی
 کھڑکیوں میں چوبی جالیان لگی ہوتی ہیں یہ دلی رخ پر اس میں ایک چوڑا وسیع زینہ
 بنا ہوتا ہے جس پر چھت بھی چلی ہوتی ہے۔

ایک متوسط الحال خاندان کا مکان اس سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ علیٰ اہموم اس کے تین جانب بلع اور صحن ہوتا ہے۔ چوتھی جانب شاہراہ عام ہوتی ہے۔ اور اوپر کا درجہ اس میں تقریباً دو فٹ باہر نکلا ہوتا ہے۔ دیواروں پر گہرا سُرخ رنگ بھرا ہوتا ہے۔ کڑی کی بے رنگی ہوئی کھڑکیوں اور جالی دار ٹیٹھوں پر جو مکان کے تین ٹلٹ حصہ پر حادی ہوئی ہیں دیواروں کا یہ سُرخ رنگ خوب زیب دیتا ہے۔ مکان پر لمبے لمبے سرد شہوت۔ اور پھول کے درختوں کا گھنا سا یہ ربا کرتا ہے۔ جن کے پتھر طرح طرح کی تزکاریاں گندما۔ ولایتی ٹیگن۔ تروڑ۔ خرکوزہ۔ گرم گلد اور پودے وغیرہ تیار ہوتی ہیں۔ اور ان کو پہلو پہ پہلو گلاب چینی۔ تار سنج۔ انار۔ اور لاکھار خولنا بغیر اس کے کہ کسی مشرقی باغبان کو زیادہ زحمت مٹانی پڑی ہو عجب بے تکلفی کے ساتھ کھلتے اور پھلتے رہتے ہیں۔

بیچنے کی منزل پر دو کمرے جن میں جانے کا دروازہ بھی الگ ہوتا ہے؟ سلام حق، ڈرائنگ روم کہلاتے ہیں یہاں صاحب خانہ اپنے مرد احباب سے ملتا ہے اور اسی بیچنے کے باقی ماندہ حصہ میں یا اور بیچنا نہ ہتا ہے۔ اوپر کی منزل خالوتان حرم اور بال بچوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اور اس کا اسباب خانہ واری سخت گندے۔ قالین اور نمے وغیرہ ہوتے ہیں۔

تو کون سیہر مکانوں میں صاحب مکان کے رتبہ مذاق۔ اور دولت کے مطابق بڑے چھوٹے ہونے کا اور نیز ساز و سامان کے اعتبار سے بہت کچھ فرق ہوتا ہے۔ اور اسی اعتبار سے ان کے مکانوں کو دارالاساطتہ قطنیہ سے قرب اور دوری ہوتی ہے۔ بہت بڑے صاحب مرتبہ لوگوں کے مکان شہر کے اندر اُن سے کم درجہ والوں کے وہاں سے قریب اطراف و جوار میں۔ اور جو لوگ ان سے بھی اتر کے ہیں در کے اضلاع و بلاد میں رہتے ہیں۔ نیز دولت مندی و مالی مرتبہ کا امتیاز پُرانی وضع کی عمارت یا نئی شان و قطع کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے لیکن جو زیادہ استطاعت نہیں رکھتے ان کے مکان پُرانی ہی وضع کے ہیں۔ اور جن کو خدا نے زیادہ دولت دی ہے انھوں نے جدید ترمیموں کے مطابق قصر و ایوان بنوائے ہیں۔ مگر سب کے اوپر والی چھت سُرخ کچرون سے بٹی ہوئی ہے

اور مقام کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یا بڑے بڑے باغون کے گھونگھٹ میں
 واقع ہیں یا پھر خوش دریا سے باغوں کی لہروں کے آغوش میں ہیں۔ دریا کنارے والی
 کوشکیں از سر نیا لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ ان سامنے کے برآمدہ میں ستون البتہ سنگ
 مرمر کے ہیں جو اکثر آس پاس کی پرانی منہدم عمارتوں سے کھود کے لائے جاتے
 ہیں۔ یہ بڑے بڑے حصے ان کے اُچرے اور آگے کی طرف بکھے ہوئے کوٹھے۔ ان کے
 چبھے اور بوج۔ ان کے نازک براہ سے اوچھتیں۔ ان کی نظروں میں کھپ جانے
 والی رنگ آمیزی۔ اور ان کا زمین سبزہ ایک عجیب شاندار تصور نظر کے ساتھ
 پیش کر دیتا ہے۔ جہاں جو زنا خانون کی کھڑکیوں پر نصب ہیں۔ ان میں گول گول
 روزن ہوتے ہیں جن میں سے خاتون حرم بغیر اس کے کہ ان کے چہرے تک کسی
 نظر کی رسائی ہو اپنے دیوانخانے سے بیٹھے بھی بیٹھے باہر کے تغیر پذیر منظر کی سیر کر لیا
 کرتی ہیں۔ جہاں جھوٹی جھوٹی کشتیاں۔ اسٹیم۔ اور دنیا کی تمام قوموں کے جہاز
 براہر گزرتے رہتے ہیں۔ مکانون اور دریا کے امین ایک پتلا کلیارہ شایون کو کھینچ کے
 لپکاڑ کیلے چلا گیا ہے جو دو تین فٹ سے زیادہ چڑا نہیں مکانون کو پانی کی دست برد
 سے الگ کرتا رہتا ہے۔ اس راستہ میں میان دریاں براہر پل بستے پلے
 گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے راستہ کے نشیب و فراز نے عجب پر لطف لہریا
 بنا دیا ہے۔ ان پلوں کے نیچے دریائی راستے ہیں جن میں سے ہر کے سمت در
 مکانون کے آغوش میں پہونچتا رہتا ہے۔ مگر ان دریائی پراپوٹ راستوں کی روک
 تمام کے لئے پلوں کے نیچے پھانک قائم ہیں جو اکثر بندرستے ہیں۔ اور ضرورت کر
 اوقات میں کھلتے ہیں تو کشتیاں آگے ان زمینوں اور پختہ لپیٹ فارمون سے لگ جاتی
 ہیں جو مکانون کے اندر بنی ہوئی ہیں اور جن کے ذریعہ ہے اکثر عورتوں اور مردوں کی
 ایک دوسری جگہ آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ اسی سبب سے قسطنطنیہ میں ہمندر اکثر
 گذرگاہ عام کا کام دیتا ہے۔ اور لوگوں کی زیادہ آمد و رفت کشتیوں ہی کے ذریعہ
 سے ہو ا کرتی ہے عرض ترکون کا مکان عام اس سے کہ شہر میں ہو یا دیہات میں ایک
 کشتیوں کی آمد و رفت کے قابل بے قاعدہ سی و منزلی عمارت ہوتا ہے۔

تذکیر و تانیث

اردو میں مذکر و مونث کا جھگڑا اس بلا کا ہے کہ جو لوگ اس زبان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سب دشواریاں جھیل لے جاتے ہیں مگر تذکیر و تانیث کے متعلق کچھ زور نہیں چلتا۔ بڑے بڑے اردو دان کو اکثر اوقات شبہ پڑ جاتا ہے اور کوئی ایسی تدبیر نہیں آتی کہ آسانی سے الفاظ کے مذکر و مونث ہونے کا پتہ لگالیں۔ بڑی خوشی اور کامیابی کی بات ہے کہ جانشین امیر مینائی مرحوم جناب علی نے مندرجہ عنوان نام کی یہ کتاب تصنیف فرما کے ملک کے ہاتھ میں ایک ایسا ادبی نایہ دے دیا ہے کہ جس لفظ کی تذکیر و تانیث کو چاہیں دم بھر میں چند ورق الٹ کے معلوم کر لے سکتے ہیں۔

میری رائے میں یہ کتاب ہر اردو زبان کے مشایق کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ چھپائی بھی بہت پاکیزہ ہے۔ اور کاغذ بھی اچھا لکھا گیا ہے۔ اور ۲۰ × ۲۶ پیمانے کے ۳۶۸ صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔ قیمت صرف دو روپیہ کلدار۔ شائقین جناب مصنف کی خدمت میں رشید آباد دکن۔ افضل گنج کے پتہ پر خط بھیج کے طلب فرمالیں۔

اے گائڈ ٹو پرشین آریباک وٹس اینڈ پلورس

یعنی فارسی زبان میں جو عربی الفاظ مستعمل ہیں ان کے ماوے اور جمعین بتا دینا والا رسالہ اصل الفاظ عربی خط کے ٹائپ میں ہیں اور ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں بتایا گیا ہے اس کتاب کے ذریعہ سے عربی الفاظ کے ماوے مننے اور ان کی جمع باسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ عربی و فارسی خوان طلبہ مدارس انگریزی کو اس کی ایک جلد بجز روپے پاس رکھنی چاہئے۔ قیمت ۱۲/- دروہشتین جناب مصنف اے۔ اے حسام الدین صاحب مدرس فارسی ٹریننگ کالج پونہ کی خدمت میں بھیج جائیں۔

تصنیف

دکھان کے گائڈ ٹو پرشین آریباک وٹس اینڈ پلورس کے مصنف کا ہے۔ جن حضرات کے پاس وہ ہو گیا ہے براہ کرم تصبیح فرمائیں۔ چونکہ اس رسالہ میں پہلی جلد ہے۔
خاکسار منیجر دکھان



تاریخ عالم میں مسلمانوں کی ترقی کا دور بھی ایک عجیب زمانہ ہے۔ اس وقت کی تاریخ پر صوفیہ تعلیم ہو گا کہ اُن دنوں مسلمان ایک طرف تو تمام دنیا میں مقدس مذہب اسلام کی اشاعت کا عزم کئے ہوئے تھے۔ دوسری طرف اُن کے ہر فرد کے دل میں علم و علوم کے حصول کی بھی لو لگی ہوئی تھی۔ ان خواہشوں کے ساتھ ہی ملک گیر سی کا شوق اور تہنگ آہی کے حاصل کرنے کی تمنا بھی انکا دامن بچڑھے ہوئے تھی۔ ان چاروں باتوں نے اس زمانے کی تاریخ کو ایسے ایسے عظیم الشان کارناموں کا مخزن بنا دیا کہ اب انکی ترقی ناموسوی کا اندازہ کرتے وقت خیال کی آنکھ بھی چڑھیا جاتی ہے۔ افسوس کہ یہ وقت حیرت قدر جہاد و جلال اور شان و شوکت سے پر تھا اسی قدر کم اس کو خستہ حاصل ہوا۔ مسلمانوں نے مذہب سیکھا۔ تمدن میں ترقی کی چین سے ہسپانیا تک تمام معلومہ دنیا کو فتح کیا۔ اُس زمانے کے عروج و علم کو حاصل کرنے اور انکو اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچانے کے علاوہ کئی چیزیں علم اور نئے فن ایجاد کئے۔ اور اُن کو معراج کمال پر پہنچایا۔ مگر جب کابلی۔ جہانپور اور کراچی کے طلبی کے شمار ہوئے۔ تو سب کچھ ایک دم ماتم ہو گیا۔ زمانے نے سب ترقی اور تہزل کے رنگ ایک ہزار برس کے اندر ہی اندر دکھائی اگر دنیا کی ابتدا سے اب تک کے وقت کا خیال کیا جائے تو ہماری ترقی کا زمانہ بلی کی ہچک کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ ادھر آیا۔ ادھر چلا گیا۔ اگرچہ دیگر اقوام کی نسبت ہماری ترقی

حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہوئی مگر ہمارا زوال اس سے بھی زیادہ تیز رفتار کے ساتھ ہوا۔ اپنے بزرگوں کی صدیوں کی کمائی ہم نے سالوں میں نہیں بلکہ ہفتوں میں لیا میٹ کر دی۔ جب ہم تصور میں اپنی قوم کے عروج کا نقشہ کھینچتے ہیں اور پھر اپنی اس تنزل یا منتحالت کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہماری زبان سے یہ اشارہ نکل جاتے ہیں۔

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط دامن باغبان و کعبہ کفر و شس ہے
یا صبح دم جو دیکھتے آکے تو بزم میں نے وہ صراحی جام نہ جوش و خروش ہے
دایغ فراق سرت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی جوش ہے

عروج تو ہمارا کمال پر پہنچا ہی تھا۔ مگر افسوس زوال اس سے بھی زیادہ انتہائی درجہ پر پہنچا۔ وہ قوم جو کبھی اقوام عالم میں ممتاز تھی آج دوسروں کی ہی نظروں میں ذلیل نہیں بلکہ خود اپنی نظر میں بھی خوار ہے۔ وہ نمایاں کام جو کبھی ہمارے ہی بزرگوں نے انجام دئے تھے آج ہمیں انسانی طاقت سے باہر دکھائی دیتے ہیں۔ اور اگر ہم دیگر اقوام کے افراد کو وہی کام کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں تو یہ کھسک خاموش ہو جاتے ہیں کہ ”ان پر خدا کا سایہ ہے“ ”ان میں ماورائے انسان ہے“ موجود ہیں ”وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں“ ہمارا ان کی تخلیق کرنا کو سے اور ہمیں کی مثال تو وہ علوم جن میں ہمارے بزرگوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ آج ہمیں ایسے شکل نظر آتے ہیں کہ ان کے ابتدائی منازل بھی سٹے نہیں کر سکتے۔ انہیں میں ایک علم ریاضی بھی ہے کہ جس کو ہمارے اسلام نے اہل ہندوستان سے حاصل کر کے بعد اس قدر دست دی تھی کہ اہل یورپ بھی باوجود ہیکڑوں برس کی جدوجہد کے اس سے آگے بہت ہی کم ترقی کر سکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب ہمارے مریخی اس علم کے میدان میں جولایاں نہ دکھاتے تھے بلکہ مستورات بھی اس میں کمال حاصل کیا کرتی تھیں آج یہ حالت ہے کہ اگرچہ پنجاب میں مٹھرا فضل محمد خان سابق پرنسپل مدرسۃ العلوم (علیگڑہ) اس علم ریاضی میں خاص امتیاز حاصل کر چکے ہیں یعنی جس سال انہوں نے ریاضی کا ایم اے کا امتحان دیا تو تمام صوبہ میں اول سے اور سرکاری وظیفہ پر ولایت تحصیل علم کے لئے بھیجے گئے اور صوبہ بجاہ متحدہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے اس علم میں وہ قابلیت پیدا کی جس کا نہ صرف تمام عالم اسلامی بلکہ یورپ

قرار کرتا ہے مگر کچھ بھی چار سے عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ علم ریاضی سے ہم مسلمانوں کی تعلیم کو مناسب ہی نہیں ہے۔ کاشکے یہ تنگ خیال لوگ صغبات تاریخ کی سیر کریں اور دیکھیں کہ اربعہ کی تقریروں کو جو عوام اسی علم ریاضی کے اہم مسائل کو حل کرنے کے لئے جو آتی تھیں کس طرح لکھو لکھا آدمی سینکڑوں نہیں ہزاروں کوس کا سفر کر کے پہنچنے کے لئے جمع ہونے تھے۔ یہ تو ایک عورت کے کمالات تھے۔ آؤ اب ذرا یہ بھی دکھائیے کہ ذرا اہل اسلام نے اس علم کو کقدر و ست دی تھی اویہ کہ علم ریاضی کی موجودہ حالت کس قدر ہمارے بزرگوں کی کوششوں کی ثمر بار ہے۔

مسلمانوں نے پہلو و حکماء یونان کے و فزون کو لکھنگا لا اور اس بحر بیکران میں سے جو قیمتی گوہر ہاتھ لگے سب کو عربی ادب کے عالیشان کھان میں قرینے سے سجایا۔ چنانچہ دنیا کے مشہور ریاضی دان اصفیاء اقلیدس۔ تھیو دوس۔ ابلونیس الیہی فیلپس وغیرہ یونان کے مایہ ناز تھے۔ اوبار زمانہ کے باعث مدتوں سے گوشہ انسانی میں پڑے ہوئے تھے۔ صدیان گزر گئیں مگر ان کے ناموں کو زندہ کرنے کے لئے کوئی سعی پیدا نہ ہوا۔ آخر انہیں کلمہ گو یونان نے انہیں اپنے دربار علم میں بلا کر دیا کہ ان کے کارناموں سے روشناس کر دیا یعنی ان کی تحقیقات کو عربیت کا جامہ پہنا کر لیل سے ریاضی کے عہد ان فیلد ناموں ارشمیدس کے حضور میں پیش کیا جس نے انکو نور خلعت قبولیت عطا فرما کر شاہی ”علی حرم“ (کتبخانہ) میں جگہ دی اور لالہ والوں کے ساتھ شکر یہ کے سوسکھے نگاروں سے نہیں بلکہ سچے قیمتی جواہرات سے بھر دئے۔ حکیم ارشمیدس کی روح بھی جو یونانی عہد علماء کا ایک چمکدار موتی تھا مسلمانوں کو دے دینا دیتی ہے جنہوں نے اس کی ان تمام تصانیف کو جو اس نے گمراہ اور اسطوانات کے متعلق خدا معلوم کس کس محنت و عرق ریزی سے ترتیب دی تھیں اپنی علمی زبان کا قیمتی جلد ہی عطا نہیں کیا بلکہ بھرا کھرا رے کے نیا سب موتیوں سے اُن کے خوبصورت چہرہ کی زیبائش کو اور بھی دو بالا کر دیا۔ یعنی انھوں نے اس داماد حکیم کے خیالات کی اس خوبی سے شرحیں لکھیں کہ اس کی تمام تصنیفوں کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر خود ارشمیدس بھی اُس زمانے میں پیدا ہو کر اپنی ان تمام تصانیف کی شرحیں لکھنا چاہتا تو ایسی خوبی سے کبھی نہ لکھ سکتا جیسا کہ ہمارے اہل ان کے لئے لکھا ہے۔

اہل اسلام نے یونانیوں کے مردہ علوم کے زندہ کرنے میں جو سرگرمیاں دکھائیں اس سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انھوں نے صرف اتنے ہی برقاعت کی بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انھوں نے اس کی جائی فرض سے فراغت پائی تو خود فکر کر کے گہرے سمجھ و ادراک میں ریاضی کے متعلق نئے نئے نکات کی قیمتی گوہروں کی تلاش میں غوطہ کھائے۔ اور ان کی ان کوششوں کو مکی جند و جد یا جوئیدہ یا بندہ کو موافق قدرت نے اکثر و فقہ کامیابی کی بجائے بھی پہنچایا۔ البتہ ان کی جو بلاشبہ عرب کا بطلیموس تھا اس نے علم مثلث یا ٹریگنومیٹری (Trigonometry) میں جو مثل ریاضی کی ایک پل دار شاخ ہے۔ مندرجہ ذیل ایجادیں کیں۔

(۱) بطلیموس اور اس کے پیرو ترون کا استعمال کرتے تھے مگر اس نے اپنی ذہانت سے نصف ترون کا استعمال کیا۔

(۲) کردی مثلثوں کی پیمائش کا بنیادی قاعدہ دریافت کیا۔

(۳) جیب اور تمام جیب یعنی سائن (Sine) اور کو سائن (Cosecant) کی اصطلاحیں اختراع کیں

(۴) حماس یعنی ٹینجٹ (Tangent) کا استعمال شروع کیا اور اس کو آفتابی ربع و اُرون کے حساب میں شامل کر کے اس کا نام ظل محدود رکھا یہی آج کل خط حماس کہلاتا ہے۔

البتہ ان کے تقریباً ایک صدی بعد ابن یونس کا زمانہ آیا تو حماس کے استعمال کو اور زیادہ عمومیت حاصل ہوئی۔ ابو الوفا نے بھی اس کا استعمال کیا۔ اس حکیم (ابو الوفا) نے علم مثلث کے متعلق بعض اور خطوط بھی ایجاد کئے جن سے اس نے اس علم ہیئت کے نظری مسائل حل کرنے میں کام لیا ہے جو کہ وہ کی سطح پر منطبق کئے جاتے ہیں۔

ان خطوط کو موجودہ زمانے میں حماس ظل تمام خط قاطع وغیرہ کہتے ہیں مگر اس نے انہیں ظل تغاضل۔ ظل مستقیم یا عمودی اور قطر الظل کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ اسی طرح کردی مثلثوں کی پیمائش میں جو چھ قاعدے رائج ہیں ان میں پانچواں قاعدہ جابر فلکی المتوفی ۱۱۵۰ھ کی ایجاد ہے۔

۱ چشم تصور میں آج - سے نو برس پہلے کے وقت کا نقشہ کھینچو۔ جبکہ دنیا میں گیا رہوین صد سچی سچی کا دور دورہ تھا اور اس بھارت ووش کے مشہور مندرون اور پات شالون کی سیر کر دو انہیں میں تھیں ایک وصوتی پوش پنڈت چندن کا ٹیکا لگائے بڑے اطمینان سے آسن ہا۔ مالا جھتا ہوا نظر بڑے گا جس کے سامنے بدیا رتھوں کی ایک بڑی جماعت تحصیل علم میں مشغول دکھائی دے گی۔ اس مہارشش کے چہرے پر غور کر دو گے تو اس کے اندر تاریخی خون جوش مارا معلوم ہوگا اور اس کے چہرے سے نور اسلام کی شاعین نکل نکل کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک دین گی۔ یہ کون ہے؟ وہی غریب الوطن ابوریحان البیرونی جس کا نام عالم ہیئت اور دنیاوی ریاضی میں خاص ادب اور رغبت سے لیا جاتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے قدیم عربی علم ریاضی کو ہندی علم ہندسہ کی مدد سے مستحکم کر دیا کہ علماء متاخر تو صدیان گزرنے پر بھی اسے بہت ہی کم اضافہ کر سکتے ہیں۔ اس یورپ کو پیدا ہونے سے ایک زمانہ گزر گیا۔ اور عرصے سے علم ریاضی پر انکی خاص توجہ مبذول ہے مگر ریاضی کی عظیم الشان دیوار اس جو افرو پر یوسی نوکٹری کی تھی اس پر علماء فرنگ بھی تکیہ دو رتوں سے زیادہ بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ علم مثلاً میں جو مختلف المقدر زاویوں کی جیبوں اور تمام جیبوں یعنی سائنس اور کوسائنس کی جدولیں ہیں اگرچہ انکی بنیاد تو اہل اسلام نے بہت پہلے سے ڈال دی تھی مگر ان کو جبہ تکمیل عطا کرنے کا فخر البیرونی کو حاصل ہے۔ علم جبر و مقابلہ یا الجبرہ کی شاندار عمارت جو قلعہ ریاضی کا بڑا منبید اور مضبوط حصہ ہے اس کا بنیادی پتھر بھی ہمارے ہی اسلاف نے رکھا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ انہوں نے اس عمارت کے لئے مصالحہ ہند۔ ایران اور یونان سے اکٹھا کیا مگر چونکہ اس سے پہلے اس علم کی کوئی جد اگانہ صورت نہ تھی اور اگر کچھ تھی بھی تو بہت ہی ابتدائی حالت میں تھی جیسا کہ کسی عمارت کے بنے سے اس کی اینٹیں ذرات خاک ہوتی ہیں اسی طرح جبر یہ اصول بھی اس زمانے میں بہت ہی ابتدائی حالت میں مختلف داغون میں بکھرے پڑے تھے۔ مسلمانوں نے انھیں بڑی محنت سے اکٹھا کیا اور ان سے نتائج اخذ کر کے اس عظیم الشان علم کی تدوین کی بنا ڈالی۔ اور اپنے زمانہ عروج میں ہی اس کو ایسی حالت پر پہنچا دیا کہ جس پر ان کے جانشین و نمایان فرنگ بڑی آسانی سے موجودہ شاندار عمارت کھڑی کر سکے۔ اس علم میں سب سے پہلی تصنیف ابو جعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی

کی ہے۔ اور اس میں فارسیوں۔ یونانیوں اور ہندیوں کے اصول ریاضی کو اکٹھا کر کے ان سے علم جبر و مقابلہ کا استخراج کیا ہے۔ اس کے بعد ابو کامل شجاع بن بلہم نے اس علم میں کئی کتابیں تحریر کیں۔ جو علمی دنیا میں خاص قدر کی نظر سے دیکھی گئیں۔ اس نے جبر و مقابلہ کی چھ تصانیف میں ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی تھی۔ غلاما ندلس (ہسپانیہ) نے اس کی اس قابل قدر تصنیف کی کئی شرحیں لکھیں جن میں قرشی کی شرح سب سے بہتر ہے۔ مسلمانوں نے اس علم میں جو جو اضافے کئے ان کی فہرست تو بہت طویل ہے مگر یہاں بطور مثال میں صرف ایک پیش کئے دیتا ہوں حکیم ابو سعید سکرہ اور عمود کے مسائل کو الجبر سے حل کرنے میں ناکام رہا اور آخر اس نے یقین کر لیا کہ یہ مسائل اس علم سے حل ہی نہیں ہو سکتے مگر جب ابو جعفر خازن نے انہیں مسائل کی تحلیل کا ارادہ کیا تو اس نے بے غر و ملی قطعاً کے ذریعہ سے اس کو رکھ دے کو سلجھایا۔ ابو حنیفہ دینوری المتوفی ۲۸۱ھ ہجری ابو الفایز خانی ابو العباس ہرخی متوفی ۳۸۱ھ مگر تصانیف متعلق علم جبر و مقابلہ دنیا نے ریاضی میں خاص وقعت رکھتے ہیں۔ محمد بن مسعودی نے بھی اس علم میں ایک رسالہ لکھا ہے جو نہایت جامع مفید اور تمام مسکون پر حاوی ہے نصیر الدین طوسی کی کتاب الظفر۔ ابن خلوس مارونی کا لصاب الجبر ابن علی موصلی کا لصاب المفید۔ ابن اسلم اور ابن معلی کی جامع الاصول اور ابن یاسمین کا جزمہ بھی اسی علم کی قیمتی تصانیف ہیں۔ اقلیدس کو بھی مسلمانوں نے بہت کچھ ترقی دی۔ بہت سے مسائل کئے نکالے اور بہت سی شکلوں کے حل زیادہ آسان کئے۔ بعض مسائل کو متعدد طرح سے ثابت کیا اور سب سے بڑھکر یہ کہ انھوں نے اس کے متعلق اس قدر عمدہ اور کثرت سے تصانیف کیں کہ عربی علم ادب کی بارگاہ میں ریاضی کی اس ہر نہاں ریاضی کا بھی خاص قصور تیار ہو گیا چنانچہ حسن بن ہشتم نے جو کتاب اس علم کے متعلق لکھی ہے اسکی نسبت علماء کا خیال ہے کہ یہ ان کتابوں سے ہے جنہیں ابتدائی ہندسہ کی تکمیل کا فخر حاصل ہے۔

علم مسامتہ پر بھی اہل اسلام نے کچھ کم تو جو مبذول نہیں کی۔ قرون وسطیٰ میں جبکہ مسلمانوں کا ستارہ اقبال نصف النہار ترقی پر بڑی آب و تاب سے چمکاتا تھا

ان کے مقبوضات تمام معلوم کردہ ارض پر چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں حکومت کو سب سے زیادہ آمدنی صرف زمین ہی کے لگان سے ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ انتظام مملکت کو قائم رکھنے اور دنیا میں تمدن اسلامی کو اشاعت دینے کے لئے انھیں لازمی طور پر اس علم کو خاص اہمیت دینی پڑی اس علم میں انھوں نے قابل قدر تصانیف ہی نہیں کیں بلکہ اس کے اصولوں اور قاعدوں کا انھوں نے عملی طور پر استعمال بھی کیا۔ بلاشبہ اس بارے میں ان کی کوششیں آخری خیر سے باہر ادوی کا سہرا حاصل کر کے رہیں۔ اور اس علم کی ترقی سے ان کے نظم و نسق اور تمدن میں ایک قسم کی نئی روح پھٹ گئی۔ آج جو کچھ اس علم کی روز افزون ترقی کے باعث فلاح ملک کے لئے نئے سامان دیکھتے ہو۔ ان سب کے انتظام کا سلیقہ ہمارے لائق حکمرانوں نے ہمارے فاضل اسلاف سے ہی سیکھا ہے۔ بعد ہی ہند مولانا حالی سچ فرماتے ہیں۔

کیا جا کے آباد ہر ملک ویران جہاں کے سب کی راحت کے سامان
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیابان انہیں کردیا رنگ صحن گلستان

ہمارا بوجو دنیا میں آئی ہوئی ہے

یہ بود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

یہ ہموار سرزمین یہ راہیں مصف دو طرفہ برابر درختوں کا سایا
فتان جابجا میل و فرسخ کے برپا سرورہ کوئین اور سرزمین ہیا

انھیں کے میں سب نے یہ چربے اتارے

اُسی تافلے کے نشان میں یہ مارے

علم ہندسہ کی دیگر شاخوں کی طرح مسلمانوں نے فن ارباع پر بھی خاص توجہ مبذول کی یہ فن ان میں زیادہ ہر دلعزیز اس لئے ہو گیا کہ وقت کے حساب کے لئے پہلے پہلے ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔ نویں صدی عیسوی میں اس فن کی پیدائش ہوئی اور اس کو مسلمانوں نے دودھ کی نگہ اپنے قیمتی وقت کا خون اپنے پسینہ میں ملاطکہ پلایا۔ اور بہت سے مسلمان مردان خدا نے اس فن پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ محمد البغدادی نے جو دسویں صدی عیسوی کے آسان علم ہندسہ پر ایک کتاب لکھی اس کا نام تھا اس علم کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور اس میں اس

اشکل کو خستہ تقسیم کے ذریعہ سے ایسے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے قواعد بیان کئے جو
اعداد منفرد و غدد کے ساتھ تناسب رکھتے ہوں۔

مناظرہ مرایا (مستطوع) ہیئت (Astronomy) اور قوائید (میکلکس)
جو نیم ریاضی علوم ہیں ان میں بھی مسلمانوں نے بہت جولاہیاں دکھائیں ہیں۔ مناظر میں
ابوعلی الحسن بن علی بن مسعود قرطبی اور محقق طوسی کی تحقیقات بڑے پائے کی مانی
جاتی ہیں۔ علی بن عیسیٰ نے بھی اس علم کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے
ایک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ رطائیوں اور محامروں کے وقت دشمن کی فوج کو بارود
کے بغیر صرف آتش شیشوں کے استعمال سے کس طرح جلا کر خاکستر کر سکتے ہیں
Astronomy علم ہیئت کے متعلق جو کچھ مسلمانوں نے کیا وہ ایسا نہیں ہے کہ
اس چھوٹے سے مضمون کے احاطہ میں آسکے نیز رد و علمی رسائل اور اخبار میں
اس کے متعلق بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کے تکرار کی
ضرورت نہیں۔ تو اسے آئید میکینکس (Mechanics) کی تحقیقات میں جو مسلمانوں
نے جاکر دیان کین انکا اگر اندازہ کرنا ہو تو مولانا شبلی کی کتاب میکینکس اور
مسلمان ملاحظہ فرمائے۔

اہل اسلام کو علم ریاضی کے متعلق ترقیات اور تحقیقات کا جو بیان اوپر
بطور شتے نمونہ از خردارے ہوا ہے۔ وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ وہ لوگ
جو یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان ریاضی کی تحصیل اچھی طرح نہیں کر سکتے غلطی پر ہیں۔ کیونکہ
جن لوگوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں سے کہیں زیادہ
”مسلمان“ کہلانے کا استحقاق رکھتے تھے۔ وہ ہم سے بہت زیادہ احکام دین کے
پابند تھے وہ اسلام کے سچے پیرو نہیں بلکہ جان نثار عاشق تھے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا
کہ آخر مسلمانوں میں یہ خیال کس طرح پھیل گیا کہ ”ہم علم ریاضی نہیں پڑھ سکتے“؟ وہ کیوں
عام طور پر اس علم سے متنفر پائے جاتے ہیں؟ اور ہمارے جو بھائی امتحانات
یونیورسٹی میں فیل ہو جاتے ہیں ان میں اکثر صرف ریاضی میں ہی کمزور ہونے کی
وجہ سے کیوں ناکام رہتے ہیں؟ غور کرنے سے ان تمام سوالات کا جواب یہ
منا ہے کہ دراصل ہم مسلمانوں میں استقلال اور جرم کرکام کرنے کی عادت نہیں ہے

اور یہی وہ کمی ہے جو ہماری علمی ترقیات میں علوج ہے مسلمان بچے علم ریاضی سے
 اسی واسطے بھاگتے ہیں کہ انہیں استقلال کے ساتھ محنت کرنے کی عادت
 نہیں ہوتی۔ مگر سناں علم ریاضی سے کرنے کے وقت وہ خیال کی گاڑی جسے
 ذہانت اور تدبیر کے گھوڑے کھینچتے ہیں اسکے دو پیہے یہی محنت اور استقلال
 ہیں اور انہیں دو پہیوں کی عدم موجودگی یا بوسیدگی کی وجہ سے اس علم کی منزلت
 طے کرتے وقت ہماری اور اک کی گاڑی یا تو چلتی ہی نہیں اور اگر چلتی بھی ہے تو
 رستے میں ہی رک جاتی ہے۔ اور ایسی رکتی ہے کہ آخر بد دل ہو کر ہمیں اس
 راستے سے کنارہ کرنا پڑتا ہے اب اگر یہ پوچھا جائے کہ ہم میں محنت اور استقلال
 کی عادت کیوں نہیں؟ تو دیگر حباب چاہے اس کا جواب کچھ ہی دین مگر میں تو
 ضرور یہی کہوں گا کہ یہ عمدہ صفات ہم میں سے صرف اس لیے زائل ہو گئیں کہ ہم
 آج کل مقدس اسلام کے احکام کو انکے اصلی معنوں میں سمجھنے اور ان پر عمل کرنیکی
 کوشش نہیں کرتے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہماری عاقبت سدھارنے
 کے ساتھ ہی ہمارے اپنی موجودہ زندگی بھی خوشحال اور باعزت بنانے کے ڈھنگ
 بتاتا ہے۔ وہ تمام صفات جن کی انسان کو علمی اور تمدنی ترقی کے لیے ضرورت ہے ہم میں
 تب ہی پیدا ہو سکتی ہیں جبکہ ہم اسکے پُر از حکمت احکام کی تہذیب سے قدر کریں اور ان پر
 عمل پیرا ہونے کو اپنا فرض اعلیٰ تصور کریں۔ اسلام کی اس تعلیم پر جو ہمارے ملائوں
 کی من گھڑت نہیں بلکہ خود خداوند تعالیٰ نے ہر کوئی المرسلین کے ذریعے بعوض قرآن
 پہنچائی ہے۔ غور کرو اور دیکھو کہ وہ ہمیں کس طرح استقلال سے کام کرنے کی طرف
 مائل کرتی ہے۔ وہ شخص جو ایک دفعہ اسلام کی موافق فطرت تعلیم کو اچھی طرح
 سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اور اسکو اپنا دستور العمل بنا لے گا۔ میں کہہ سکتا ہوں
 کہ پھر وہ کبھی کسی مشکل میں نہیں گھبرا سکتا اس کا ایمان ہو گا کہ نتیجہ مسرور خداوند کریم
 کے ساتھ ہے۔ مگر چونکہ وہ متصف اور علیم کل ہے اس لیے اپنے قانون کو کبھی
 نہیں بدلتا۔ اسکا قاعدہ ہے کہ وہ ہر کوشش کو بشرطیکہ صدق دل اور نیک نیتی
 سے ضرور یاد رکھے۔ وہ درجیم ہے اور یہ اسکی صفت و رحم کے خلاف ہے کہ اس کا
 بندہ تو کسی ایسی شے کے حصول کی خواہش کرے جو اسکے حق میں کسی طرح

کے حکمران نے مین پوری تیزی سے کام کرنے والا پرزہ بنا دیگی۔ غرض کہ اگر ہم سب سے پہلے اپنے مذہبی احکام کی غرض و غایت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور سمجھنے کے بعد فوراً ان کو اپنا دستور العمل بنالیں تو پھر کچھ تنگ نہیں کہ تھوڑی ہی مدت میں ہم مین وہ تمام صفات حمیدہ پیدا ہو جائیں گی۔ جو ہمارے اسلاف مین موجود تھیں اور جب یہ ہو گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم بھی اپنے بزرگوں کے سونمایان کام کرنے لگیں گے۔ اور تھوڑے ہی زمانے میں ہم مین سے بہت سے اہستاتی اور البیرونی نظر آئیں گے۔ جو میدان ریاضی مین رنگی بیٹونوں کو بچھاڑنے لگیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ پھر تو ہم جملہ علوم مروجہ مین اعلیٰ درجہ کی قابلیتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور ہماری قوم جلدی سے زندگی کے ہر شعبہ مین دنیا کی دوسری قوموں سے بڑھی ہوئی دکھائی دے گی۔

اے خداوند کریم! ہم مسلمانوں کو توفیق عطا کر کہ ہم تیرے بتائے ہوئے سچے احکام پر عمل پیرا ہوں اور اس طرح ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو تیری ان عنایات کا مستحق ثابت کریں جو آج سے ایک ہزار برس پہلے ہم پر مبذول تھیں۔ آمین ثم آمین۔

راقم
خاکسار نافر ہو شیار پوری

درستہ العلوم مسلمانان علیکندہ
۲۹ جنوری سنہ ۱۳۷۰ھ

۷ خیال یار

کتنا باوضع ہے خیال الٹا کیسی مین بھی آئے جاتا ہے بیشک آئے جاتا ہے اور کسی وقت ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اس سے زیادہ پابند وضع دنیا مین شاید اور کوئی ہو مگر سچ کہہ دیں ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ اس سے بڑھ کر باوجود باوضع کوئی اور چیز بھی اس عالم مین پیدا کی گئی ہے۔ ہم چاہے جس حالت ہوں اور چاہے جو کیفیت ہم پر طاری ہو لیکن ممکن نہیں کہ خیال یار اس وقت ہمارے پاس نہ ہو اور ہمارے پہلو مین بیٹھ کر تسلیان نہ دے رہا ہو۔

یہ خیال یار کی کرشمہ سازی نہیں تو اور کیا ہے کہ ہم در در فرقت سے پیچمن ہیں اور کسی پہلو کسی کر وٹ قرار نہیں آتا مگر یہ ہی وہ میحان نفس ہے کہ فوراً ہمارے پاس

آتا اور اپنا تسلی آمیز ہاتھ ہمارے سینہ پر رکھ کر درد کہہ دیتا ہے۔ یاد جانان کی اسن سے زیادہ سبغ نہائی اور کیا ہوگی کہ ہم غیب فرقت میں کسی وعدہ فراموشس ناز آفرین کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور اس کے آنے سے بالکل مایوس ہیں مگر یہ دوڑا ہوا گیا ہے اور ہمارے تغافل شمار بہ چین کی پر تنویر تصویر مشتاق آنکھوں کے سامنے لاکے کھڑی کر دی ہے۔

ہمارے ستم کش دل ریا اور جفا جو کا فر ماجرا پر روسیادہ قیب کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہے اور اس کی ذات سے کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ہمارے پر سی جلال محبوب کو ہم سے اطمینان سے ہم آغوش و ہم صحبت ہونے کوئی خوش گوار موقع دیگا۔ لیکن خیالی دنیا میں آکے وہ بھی مجبور و بے بس ہو جاتا ہے اور اس سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہماری معشوقہ حور بقیال کو عالم خیال میں نہ آنے دے۔ اور ہمیں ویداریار سے محروم رکھے خیال دلدار کی اس سے بڑھ کے کرم گشتری و مہربانی اور کیا سمجھی جاسکتی ہے۔

آہ آغوش حقیقی تو کہاں ہو کہ نصیب مان تصور میں تجھے بھیج لیا کر تو بین واقعی وہ وقت بڑا ہی پر لطعت و مسرت انگیز ہوتا ہے جب ہم خیال یار سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ پیارا ناز آفرین چہرہ نظر کے سامنے ہوتا ہے اور ہم بڑی بے تکلفی کے ساتھ رخسار یار کے بوسے لیا کرتے ہیں اس وقت نہ رقیب کا سادشمن ہوتا ہے نہ حضرت خبیث کا سانحہ۔ نہ محتب ہوتا ہے نہ محل صحبت اور نہ رعب حسن ہم پر اپنا مرعوب کرنے والا اثر ڈالا ہے حسن کی عالی پایہ بارگاہ میں اس وقت جتنی اور جیسی جی چاہے گستاخیان کریں سب جائز ہے کوئی پوچھنے پچھنے والا نہیں انہیں لطفون میں محو ہو کے اور دنیا و مافیہا کو فراموش کر کے ایک فطرت شناس اردو کا شاعر کہہ سکتا ہے کہ

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن بیٹھے رہیں تصور جانان کے کئے ہوئی رقیب کا اندیشہ بھی صرف ایک دینوی جھگڑا ہے۔ اصل روک ٹوک مذہب اور دین گلی ہے جس سے پروانہ امتدادات لے کے بیخ و محتب آئے اور ہم پر مسلط ہوئے ہیں مگر عالم خیال میں سچ پوچھیے تو ان بزرگوں کا بھی زہر نہیں چلتا اس لیے

ہنہین کہ ہمارے دل تک یہ رمانی ہنہین پاتے۔ بلکہ اس لیے کہ جو گناہ خیال کے حد تک ہو اور ارکان و ہوا ریح تک نہ پہونچا ہو معاف ہے اور اس کے متعلق ہم سے باز پرس نہ کی جائے گی۔ حضرت مسیح کی شریعت نے بیشک حد اعتدال نگذرے کے ہمارے دلوں پر پھرے بٹھا دیے تھے۔ مگر اسلام کی برکتوں نے ہمیں عالم خیال میں آزاد دیا دی ہیں۔ جس کے جملہ عیش میں ہم ہمہ جہین ناز آفرین کو اس طرح چپکے سے بلا تے ہیں کہ کسی کو کا لوزن کا ن خبر نہیں ہوتی اور پھر جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ اعتراض کرے۔

ہاں صوفیہ صافیہ نے صفائے نفس کی ضرورت سے عالم خیال میں ہماری روک تھام کی کوشش کی ہے۔ مگر انہوں نے خود حسن پرستی اور کسی کی پیاری صورت کو نردبان خدا پرستی قرار دے دیا ہے لہذا اس دربار سے بھی ہمیں پر دانہ آزادی مل گیا۔ اب بھلا کس کی مجال ہے کہ کسی خیالی و لمبھی یا خیالی پسیر جانان پر دست درازی کرنے سے ہمیں روک سکے۔ برشتہ دل عاشقوں کی آرزوئیں چاہے عالم خارج میں پوری ہوتی ہوں یا نہ ہوتی ہوں لیکن اس میں دراز خاک ہنہین کہ عالم خیال میں آکر یہ ایسی ایسی بیباک نگستاخیان کر جاتے ہیں کہ مروض نازنین گھبرا اٹھتے ہیں اور بڑا غصہ و بے بسی کے عالم میں ان کی زبان سے نکل جاتا ہے: ”آنکھ بھر کر ہمیں دیکھ تو بس اندھا ہو جائے ہو“

یہ وہ عالم ہے کہ اس میں دل جلے شیداؤں کی کوئی آرزو ایسی نہیں جو پوری نہ ہو سکے اور کوئی ارمان ایسا نہیں جو کھٹکتے سے باقی رہ جائے۔

سچ یہ ہے کہ اگر خیال پار ہماری دل دہی و تسلی نہ کرے اور ہمارے پہلو میں شو کے دیہیکے نہ گدگدائے تو ہماری زندگی وبال جان ہو جائے اور فراق کی ناقابل برداشت گھڑیاں ہم سے کاٹنے نہ کھین۔ یہ تو یہ ہیں تو صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر خیال پار ہمارا مونس و غمگسار نہ ہو تو عرصہ دنیا ہمارے لیے تنگ ہو جائے اور ہم گھڑی بھر بھی نہ جی سکیں۔

حاشق جس امید پر فراق کی نہ کھٹنے والی راتیں کاٹ لیا کرتے ہیں وہ صرف خیال پار کی بدولت ہی کاٹ لے جایا کرتے ہیں اور ہنہین درد فرقت میں اگر کسی دوا

نئے سکون تھا ہے تو اسی خیال یار سے جو شربت دیدار کا گلاس پیش کر کے ادن کی
 تھام کھٹین دور کرتا اور گری ہوئی تمام نگینیں دل سے مثل حرف غلط مٹا دیتا ہے
 کسی کی ناز آفرین تصویر پیش نظر ہوتے ہی یہ کچھ ایسے بے خبر و مدہوش ہو جاتے ہیں
 کہ پھر انہیں کسی غم و الم کا احساس ہی نہیں باقی رہتا۔ بس یہ ہوتے ہیں اور انکی
 پرہیزش و لبا۔ طح طرح کے ارمان ہوتے ہیں اور قسم قسم کی آرزوئیں پھر جوش تنہا کے
 دریا میں تلاطم برپا ہوتا ہے۔ اور کسی کے چہرے نے ان کے اور شکوہ کرنے کا خیال
 بار بار اُن کے دل میں آن کر ہٹو کے دینے لگتا۔ ہے جس سے یہ بیخود و مجبور ہو کر اُس
 ٹائیک فریب چہرے کو جو مشربا لجا ہوا نظر کے سامنے کھڑا ہے گھورنے لگتے ہیں اور
 گھورتے گھورتے کچھ ایسے متوالے و خود فراموش ہو جاتے ہیں کہ دربار حسن میں
 وہ نا عجز نگستاخیان اور شوخیان کر بیٹھتے ہیں جو انہیں بھی میسر نہیں آسکتی
 تہنیں ایسی غیر متوقعہ و رسی سے متاثرین کے اور اس قدر غیر معمولی کامیابی
 کے نشہ میں سرسٹ و مخمور ہو کر یہ کچھ ایسے مود و سراپا حیرت بناتے ہیں کہ بیجاں
 تصویر کا اُن پر دھوکا ہونے لگتا ہے اور ابھی ان کی یہ محویت و عالم حیرت دور نہیں
 ہونے پاتا کہ وہ سراپا ناز تصویر جس سے اُن کی زندگی ہے اور جس پر یہ مرتے ہیں
 آنکھوں کے سامنے سے اُن کی یہ غفلت و بے پرواہی دیکھ کر غائب ہو جاتی ہے
 اور جب یہ کچھ آہٹ پا کر چوکنے ہیں تو نظر فریب چہرے کو کسی طرف نہیں پاتے۔
 یہ حالت دیکھتے ہی اُن کا سر و عالم محویت سب کا فور ہو جاتا ہے اور یہ ایک دلور
 آہ کہہ چکی بے اختیار سی کے لہجہ میں کہنے لگتے ہیں۔

یہ کس نے عین مزے میں جگا دیا ہم کو
 ابھی تھے خواب میں اُن کو گلوں کا بو ہے

راقم
 سیٹلم الدین شاہ ولیکر آبادی

مفتاح القرآن

بنارس کی آئی۔ جسے نزارس اینڈ کو نے قرآن مجید کے تمام الفاظ کی ایک فہرست شائع کی ہے۔ جو دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں کل الفاظ قرآن کو لغوی ترتیب سے مرتب کر کے ہر ایک کے سامنے بتا دیا ہے کہ وہ کون کون سی سورت اس کے کس کس رکوع اور کس کس آیت میں واقع ہے۔ سورۃ کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ اور شمار بھی بتایا ہے اور رکوع اور آیاتوں کا شمار بتایا ہے۔ اور اس تکمیل کے ساتھ کہ اگر کوئی لفظ قرآن پاک میں چار یا پنج سو جگہ آیا ہے تو ان سب مقامات کا حوالہ دیا ہے۔ اور انگریزی حروف میں اس لفظ کا تلفظ بھی بتا دیا ہے۔ دوسرا حصہ قرآن مجید کی فرہنگ ہے جس میں تمام الفاظ کو اسی لغوی ترتیب سے مرتب کر کے انگریزی اور اردو میں معنی بتا دیے ہیں۔ ایسی کوششیں اس سے پیشتر بھی کی جا چکی ہیں۔ مگر یہ سب سے زیادہ مکمل ہے۔ ہمارے علم میں اس تکمیل کے ساتھ الفاظ قرآنی کے حوالے بتانے کی پہلے کوشش جرمنی میں کی گئی تھی اور اس کے بعد یہ دوسری کوشش ہندوستان میں کی گئی ہے۔ لیکن یہ آخری کوشش پہلی سے بڑھتی ہوئی ہے جسکی مدد سے ہم بآسانی قرآن مجید کی ہر آیت کا پتہ لگا لے سکتے ہیں۔ اس سے نفع اٹھانے والے زیادہ تر مسلمان ہی ہو سکتے ہیں مگر افسوس کہ مذکورہ دونوں کوششیں روشن خیال عسائیوں کے ہاتھ سے حل میں آئیں۔

اچھا ہوتا اگر الفاظ کے ساتھ مضامین کا بھی اشارہ کر دیا جاتا تاکہ ہر لفظ کو جس مصنف کی آیت میں تلاش کرنا ہوتا تلاش کر لیا جاتا اور ہر جگہ دیکھنے کی زحمت سے لوگ بچ جاتے۔ اس قسم کی ایک فہرست مولوی نظام الدین حسن صاحب وکیل ہائی کورٹ لکھنؤ نے کی ہے اور ان کی کتاب زیر طبع ہے امید ہے کہ وہ کتاب ان دونوں مذکورہ کتابوں سے زیادہ مکمل ہو۔ مگر جب تک وہ نہیں ہے ہم مفتاح القرآن کو ایک تاشیعی ماہر کرتے ہیں۔ اور نزارس اینڈ کو کے مشکور گزار ہیں۔

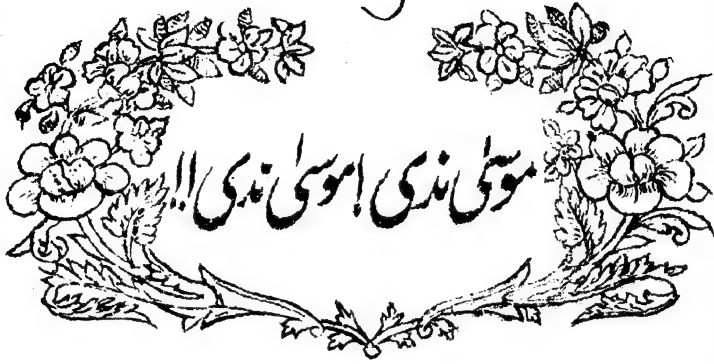
یہ کتاب نہایت عمدہ چکنے ولایتی کاغذ کے بڑے بڑے اخباری ورقوں پر بہت واضح اور روشن ٹائپ میں چھپی ہے اور مجلد لمبی ہے جسکی دفنی برا انگریزی سنہرے

حرفوں میں نام لکھا ہوا ہے۔ قیمت مکمل دو ہون حصوں کی ہیں روپیہ کلدار ہے لیکن اگر دو ہون حصہ الگ الگ یہے جائیں تو پہلے حصہ کی قیمت سولہ روپیہ کلدار اور دوسرے حصہ کی آٹھ روپیہ کلدار ہے۔ یورپ والوں نے اس کتاب کی سب سے انتہا قدر کی اور بیسیوں جلدیں ہفتہ وار جاری ہیں۔ اگر سلماٹون کی طرف سے اس کی قدر افزائی میں کوتاہی ہو تو یقیناً بڑی ناشکری ہوگی۔ جن حضرات کو سنگدانہ ہو۔ لڑا اس اینڈ کو بنارس، کوکھ کے دیویو پے اہل طلب فرمائیں۔

زبان دہلی

اس نام کا ایک نہایت عمدہ اور قیمتی رسالہ جنوری ۱۹۹۷ء سے نکل رہا ہے۔ جس کا مرکز دہلی ہے۔ اور چونکہ زبان اردو کا پہلا منبع و مرکز دہلی کا قلموعلی تھا۔ لہذا اقلہ کا خوبصورت اور شاندار پیمانہ لوح پر بنایا گیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر حضرت مایل دہلوی ہیں۔ جن کا مذاق سنجیدہ اور پاکیزہ ہے۔ کیونکہ یہ رسالہ جب سے نکلتا شروع ہوا ہے اُس وقت سے آج تک کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ چھپائی لکھائی کاغذ سب چیزیں اعلیٰ درجہ کی ہیں ہر پرچہ میں دو ایک تصویریں بھی اعلیٰ درجہ کی شاہیر ملک کی شایع ہو کر تھیں۔ مضامین بھی مشہور روزگار اناپروازوں کے ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سو اس کے کہ ملک کی قدردانی اس کی پشت پناہی کرے اور کسی بات کی کمی نہیں۔ حجم بھی ۸۸ سے ۶۴ صفحات تک رہتا ہے جو کم نہیں بلکہ اس کی قیمت ڈھائی (۵) روپیہ سالانہ مع محصول ڈاک کے دیکھتے بہت زیادہ ہے۔ ہم حضرت مایل کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اسید رکھتے ہیں کہ وہ اپنی پیشہ کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے۔





موسیٰ ندی اموسیٰ ندی!! لائے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا نام اختیار کیا ہے۔
 اور تیری پڑوسن عیسیٰ ندی نے جو حیدر آباد سے دوہی دھائی میل پر سمجھ سے آکے
 ہم آغوش ہوئی ہے حضرت عیسیٰ کا نام۔ حیدر آباد نے تم دونوں کے پڑوس میں
 جیسی جیسی ترقیاں دکھائیں۔ اور اعلیٰ حضرت سر پر آرائے دکن کے دار السلطنت
 میں جیسی شان و شوکت نمودار ہوئی اُس سے ہم کو یقین آگیا تھا کہ تم دونوں
 سے یہ بیٹا کا معجزہ بھی نمایاں ہو رہا ہے اور اچھے مولے کا بھی۔
 ہم تیری سطح پر آفتاب کی کرنوں کو کسی کی پُر نشان پیشانی کی طرح چمکتے دیکھتے
 تو اسے یہ بیٹا تصور کرتے۔ اور ہر مرتبہ جب ہم اپنے تاجدار گردن مدار کی فیاضی
 سے کسی کو نہال ہوتے دیکھتے تو اسے اچار مولے کا معجزہ سمجھتے۔

مگر موسیٰ ندی اموسیٰ ندی!! ہمیں تیری معجزاتی کے اس پہلو کا خیال ہی
 نہ تھا۔ کہ تو یہ بیٹا کے بجائے حضرت موسیٰ کا عصا بھی بن سکتی ہے۔ عصا سے موسیٰ
 کی شان دکھائی تھی تو کاش یہ شان رحمت دکھائی ہوتی کہ ”فَاَنْفَجَرْتُمْ مِیْنَهَا عِیْنًا
 عَشْرًا عِیْنًا“ (جاری ہوئے اُس سے بارہ چشمے) سمجھتے سے بارہ ندیاں
 جدا جدا جاری ہو جائیں اُن سے سرکار عالی کا ملک پہلے سے زیادہ آباد ہوتا۔ اور
 رعایا کی طرفہ الحالی ترقی کرتی۔ لیکن موسیٰ ندی سمجھتے تو عجب شان قہار می ظاہر

ہوئی۔ تو ایک آنگا فائین عصائے موسیٰ سے وہ عظیم الشان اثر دہا بن گئی جو دم بھڑ
میں مصر کی ہزار ہا خلقت کو نکل گیا تھا۔ جس نے ایک پشیم زدوں میں مصر کی آبادی
صاف کر دی تھی۔ افسوس موسیٰ ندی! ہمیں تجھ سے ایسی امید نہ تھی۔

عصائے موسیٰ کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ سمندر میں راستے ہو گئے۔ پانی
جہان تھا دیواروں کی طرح وہیں ٹھہر گیا۔ ہمارے زمانے کے آہنی پلون کی طرح
اُن میں جھریاں بن گئیں۔ اور بنی اسرائیل کے بارہ سبط بارور استون سے ایک دوسرے
کو دیکھتے بھالتے اطمینان و فایز ابالی سے پار چلے گئے۔ اور ایک معجزہ یہ بھی تھا
کہ فرعون کے لشکر نے جیسے ہی اُس دریائی راستے میں قدم رکھا پانی جوش و
خروش کے ساتھ ٹل گیا۔ سمندر تہاری کی شان سے اُبٹنے لگا۔ قیامت
کا تلام نمودار ہوا۔ اور دم بھر میں اُس لشکر کا پتہ نہ تھا کہ کیا ہوا اور کہاں گیا۔
زمین کھا گئی یا آسمان کھا گیا۔

بیشک ہم گنہگار ہیں۔ سر سے پاؤں تک معاصی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
ہمارا بال بال گناہوں سے گندھا ہوا ہے۔ مگر موسیٰ ندی! ہم سب خدا پرست
ہیں۔ ہمارے مشرک بھی فی الحقیقت موحد ہیں۔ ہمارے کفار بھی اُس ذات
وحدہ لاشریک کے منکر نہیں۔ پھر ہمارے ساتھ تجھے ایسا سلوک نہ کرنا چاہیے
تھا۔ ہم پر یہ جوش غضب ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے ظل اشد الحمد للہ
کہ سچے خدا پرست اور خدا کے برحق دین کے حامی درونی ہیں۔ ہمارے
دارالمہام نقوٹ کے رنگ میں رنگے ہوئے اور دریائے وحدت و معنیت میں
غرق ہیں۔ ایسے نیک لوگوں اور ایسی خدا پرست آبادی کے ساتھ وہ سلوک جو
کبھی فرعون اور اُس کے لشکر کے ساتھ کیا گیا تھا! موسیٰ ندی! الصاف یہ ہے
کہ تیرا یہ جوش بے محل اور تیرا یہ غیظ و غضب بے موقع تھا۔ ہم سیہ کار سہی مگر
اتنے بدتر بھی نہ تھے کہ تو ہمارے حق میں عصائے موسیٰ کی شان تہاری دکھانے
کے لئے خلقت کو نکل جانے والا اثر دہا بن جائے۔

موسیٰ ندی! موسیٰ ندی! تیرے اس سیلاب کو کوئی طوفان نوح سے تشبیر
دیتا ہے اور کوئی سیل عزم بتاتا ہے۔ ہو۔ مگر ان دونوں تاریخی واقعات کی ہولناک

بین قدامت کے پردے میں چھپ گئے۔ اور اُن کے جگر خراش مناظر
بُعد کے دُھندلے مین ہیں۔ ہمیں تو سمجھ میں کوہِ وسے ویس کی شان نظر آ رہی ہے
اور تیرا سیلاب اُس کے آتشین لاوے کا سیلاب معلوم ہوتا ہے جس میں ایطالیہ
کا شہر پومپائی غرق ہو گیا تھا۔ وسے ویس کے آتشین سیلاب نے پومپائی کو
چاروں طرف سے محصور کر لینے کے بعد اندر قدم رکھا تھا۔ اُسی طرح تیرے
سیلاب نے شہر کی اندرونی آبادی کے بعض محلون کو جبکہ لوگ غافل سو رہے
تھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور اُنھیں ایک خطرناک جزیرے میں محصور
کرنے کے بعد ڈبویا۔

مگر پومپائی کے غریب بحر آتشین آج دو ہزار برس بعد نکل رہے ہیں اُس
سیلاب نے اُنھیں اپنے وامن کے نیچے محفوظ رکھا۔ جنھیں آج کل کی زندہ
دینا اگلے عبرت ناک سیلاب کی یادگار سمجھنے کے دیکھتی ہے۔ اور اُن کی حالت
دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے سفر کر کے آتے ہیں۔ مگر موسیٰ ندی تو
بتا کہ ہمارے مُردوں کو بہا کے تو کہاں لے گئی؟ اور اُنھیں کہاں رکھا ہے؟
کہ لینے بچنے اور لطفِ صحبت اُٹھانے کے لئے نہیں تو اُن کی حسرت ناک
صورتمیں دیکھنے ہی کے لئے ہم اُن کا نظارہ کر سکیں۔ اُنھیں کہیں امانت رکھا
ہے یا سمندر کے غریب پھینک آئی؟ موسیٰ ندی، موسیٰ ندی!! یہ مُردے
نہیں یہ ہماری امانتیں ہیں جنھیں ہم سمجھ سے لین گے۔ آج نہیں تو کل قیامت
کو لین گے۔ ایک دن ضرور آنے والا ہے جب اے اژدہا صفت ندی
سبتھے اپنے یہ لذیذ لقمے اُگلنے پڑیں گے۔ اور سمجھے اپنے اس ظلم و ستم کا یقیناً
جواب دہ ہونا پڑے گا۔

آہ تیرا غیظ و غضب اتیرا جوش و خروش اتیرا لے رحم اور سنگدلی اتیری
وہ غضب ناک صورت اتیری وہ پر شکن جبین اتیری وہ بدحواس کروینے والی
بیبٹ اڑکیا تھی اور ایک دم بھر میں کیا ہو گئی؟ سمجھے کیا سمجھے ہوئے تھے
اور کیا نکلی باوہ دیکھو لوگ بدحواس بھاگے جاتے ہیں۔ کسی کو اپنے ہرے
کا ہوش نہیں۔ پردے کی بیٹھنے والیاں ننگے سر ننگے پاؤں گھون سے محل پڑی

ہیں۔ مائیں بچوں کو جھول آتی ہیں۔ بیٹے باپوں کو نہیں یاد رہے میں بہن بھائی سے چھوٹ گئی ہے۔ اور شوہر جو روکو چھوڑ آیا ہے۔ یہ کہاں جاگے جاتے ہیں؟ اور اس قدر بدحواس کیوں ہیں؟ اس لئے کہ موسیٰ ندی ایک جھوکے اُڑ رہی ہے کی طرح پیچھے دوڑی آتی ہے۔ وہ سڑکوں پر سانپوں کی طرح لہلہا کر کے دوڑ رہی ہے کہ کوئی لے لو اُسے ہڑپ کر جائے۔ گلی کو چون میں رینگ رہی ہے کہ کوئی انسانی شکار ہاتھ آئے تو اُسے مضطرب کرے۔ گھروں میں گھس رہی ہے کہ کوئی تھکا ماندہ رہ گیا ہو تو اُسے اپنا نوالہ بنائے۔ اپنی تھار جھوک سے وہ بیتاب ہے۔ چاروں طرف زندہ مخلوق کو ڈھونڈ رہی ہے۔ ہزاروں بند گناہ خدا کو منگل گئی اور بیٹ نہیں بھرتا۔ اُس کی قیامت نیز جال مکاؤن کو گرا آتی اور عالیشان عمارتوں کو ڈھاتی جاتی ہے۔ جدھر جاتی ہے ستر اڑھو جاتا ہے اور جہان تک پہنچتی ہے بالکل صفایا نظر آتا ہے وہ غریب پس ماندے جو نہ بھاگ سکے ہیں اور نہ اس عالم مدی کے ہتھے چڑھ سکے ہیں جن مکاؤن میں اُنھوں نے پناہ لی تھی اُنہیں میں دب دب کے اور خود اپنی بنائی ہوئی عمارتوں کے نیچے پس پس کے جان دے رہے ہیں۔

مگر یہ تصور بھی اُن مقامات کی ہے جہاں لوگ تیرے عمل سے پہلے چونک اُٹھے ہیں۔ اُنھیں تھوڑا بہت بھاگنے کا موقع مل گیا ہے۔ اور اپنے عزیزوں کو ڈرتے اور مکاؤن میں دبے اور بیکیسی سے جان دیتے دیکھتے ہوئے گرتے پڑتے بھاگے ہیں لیکن اُن جگہوں کی خوبی تصور دیکھی بھی نہیں جاسکتی جہاں تو نے اپنا جوش دکھانے سے پہلے ہی لوگوں کو اپنے آغوش مرگ میں گھر لیا ہے۔ وہاں کا عالم! عالم مرگ! عالم تباہی! عالم بے کسی دے! یہی نہ دیکھا جاسکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے۔ جنھیں خبر ہو گئی ہے کہ موت سر پر آ پہنچی حسرت و یاس سے بھاگے ہیں۔ مگر ہر طرف سے راستہ بند ہے۔ جدھر جاتے ہیں قیری لہر میں موت کے فرشتوں کی طرح راستہ روکے کھڑی پہرہ دے رہی ہیں کہ کوئی نکلے نہ پائے۔ جب سب راستے بند دیکھے تو خدا کے گھر کی طرف چلے۔ مسجدوں میں غفلت بھری ہوئی ہے مگر تو نے اُس حرم ربانی میں بھی قدم رکھا۔ اور ساعت

ہر ساعت تیرا ظالم ٹوہتا ہی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تیرا پانی اُبلتے اُبلتے چھوٹن سے جالگا۔ اور وہ سب پناہ گزین خدا ہی کے گھر میں سے خدا کے پاس سدھار گئے۔ یہ بھی وہ لوگ تھے جنھوں نے کچھ ملے یا ون مارے۔ بہت سے نوا سے میں جنھیں خبر بھی نہ ہوئے پانی۔ اور اُن کا بستر عیش ہی بستر مرگ بن گیا۔ آہ کتنے دکھاؤں میں جو شب زفاف ہی میں ہم آغوشی سے آغوش موت میں ڈر گئے۔ اور اوسوسی ندی اُن کے چاندی کے پلنگ ہی کو تختہ نما بوت بنا کے تو اپنے دوش پر اُٹھا لے گئی اور اُن کی روحوں کے ساتھ اُن کے جھون کو بھی عالم فنائین پہنچا آئی۔

موسیٰ ندی بسترے کسی پر تو ترس آیا ہوتا! کوئی تو تیرے دستِ ستم سے بچا ہوتا۔ عبا و کو سب روتی ہیں۔ بوہمنوں کو دیر میں۔ طلبا کو مدرسوں میں۔ صوفیوں کو خانقاہوں میں۔ غرض کسی کو کہیں نہ چھوڑا۔ جو جہاں تھے وہیں رہے اور تو اُن کے سردن پر جلا پہنچی۔ بی بیان شوہروں کے سامنے۔ بیٹھے بیٹیاں مان باپوں کے سامنے۔ بہن بھائی بہن بھائیوں کے سامنے۔ دوست دوستوں کے سامنے۔ دُوب کے مر رہے ہیں اور کسی کو بچانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وہ مرے وقت چاہتے ہیں کہ آخری وصیت کے دو کلمے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے کانوں تک پہنچا دیں مگر نہ وہ اپنے جان کے خوف سے اُٹھتا ہوتے ہیں اور نہ تو اپنے غیظ و غضب کے شور سے سننے دیتی ہے۔ معصوم بچہ مان کے آغوش سے نکل کے تیرے بے رحم آغوش میں چلا گیا ہے اور سچے سچے ان بے بسی سے کلیجہ تھام کے رہ گئی ہے۔ یہ جہیں معنوقہ کو تیری ظالم موجوں نے عاشق کے گلے سے چھڑا کے اپنے گلے لگا لیا ہے اور وہ حسرت سے دیکھ کے رہ گیا ہوا۔ ایسے جگر خراش منظروں کو دیکھنا اور ترس نہ آتا۔ اے موسیٰ ندی تیرا ہی کام ہے۔

اور موسیٰ ندی اتنی سنگدل اتنی ظالم اتنی ستم کیش۔ اور اتنی بے رحم ہے کہ تجھے نہ معصوم بچوں کی معصومی پر ترس آیا ہوا اور نہ وہ دُش دل باؤں کی ناز نہیں پر۔

یہ سب ہنگامہ اور یہ سارا شور محشر جند گھنٹوں میں ہو گیا۔ موسیٰ ندی اپنا جلال و غضب دکھا کے چلی گئی۔ عالم پر نموشی اور موت کا سناٹا طاری ہے۔ نہ سڑکوں کا پتہ ہے نہ گلیوں کا۔ نہ آبادی کا نشان ہے نہ عایشان عمارتوں کا۔ جھڑ نظر جاتی ہے پتھروں کا ڈھیر ہے۔ اور حسرتوں کا انبار۔ ایک عالم ہو ہے اور چند ساعت پہلے کی رونق و عظمت کے آثار۔ امرا نقیس کہاں۔ بے ہ بلاؤ اور کہو کہ اپنا قصیدہ معلقہ یہاں کھڑے ہو کے سنائے۔ اس لئے کہ جو سامان حسرت یہاں نظر آئے گا اُس جگہ ممکن نہیں جہاں عینہ چنر روز کے لئے بس کے چلی گئی تھی۔ گوڈا سمٹہ کہاں ہے؟ اُس سے کہو کہ اس حسرت کدے میں آ کے اپنی پُرسوز و گداز نظم ”ڈزڈ ڈیلج“ سنائے یہاں زیادہ اثر ہو گا۔ کیونکہ جس اُجڑی بستی کا سامان اُس لئے دکھایا ہے ہمارے تباہی زدہ گھر دن سے زیادہ تباہ نہیں ہو سکتی۔ اور آخرین حکیم مغربی سے کہہ دو کہ اپنے اچھوتے عربی مذاق کے قصیدے کے جند تمہیدی اشعار میں کی دھن میں گا کے ہماری حسرت نصیبی کی داد دے دے۔

لے ساربان منزل کن مجز بر دیار یار من	تاکیزان زاری کنہ پر رنج و اطلال و من
ربیع از ولم پر خون کنم اطلال را بخون کنم	خاک و من لگلوں کنم از آب چشم خیشتم
از روئے یار گری ایوان آہی نیم تہی	وز قد آن سر سہی حالی ہی نیم جہن
آہنا کہ بود آن دستان و بوستان بادستان	شد بوم و روبرام کا شد گرگ و کرکس را وطن
برجائے جام و دل می گوران نہاد مستند ہے	برجای چنگ و نای وئے آواز زنگ است و ذن

آہ! آہ! ایک جہان بھی ڈوبتا ہے تو اُس میں ڈوبنے والے پہلے ہاتھ پاؤں مارے ہیں اور جب قسمت پر زور نہیں چلتا تو اپنے نالہ و شیون کی آواز آسمان تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر ہمارے عزیزانِ رحمت ہمارے بے زبان مظلوم کس بہادر سی۔ کس نموشی۔ اور کس بے بسی سے ڈوبے ہیں۔ کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ چل بسے۔ قافلہ کے قافلہ عدم کو چلے گئے اور جس کی آواز کسی نے نہ سنی۔

سچ یہ ہے کہ یہ بھی حضرت رب العزت کے جلال کا ایک نمونہ تھا

قیامت آگئی تھی۔ خاموش و منہدم کھنڈروں سے آواز اُڑی تھی کہ لَمِنَ اللَّفْظِ
الْيَوْمِ ۚ اور عالمِ مہین سناٹا اپنی پُر ہیبت آواز میں جواب دے رہا تھا۔ ۛ اللہ
الْوَاحِدُ الْقَهَّاسُ ۛ

ہمارے حیدر آباد میں نقصوت کا بڑا زور ہے۔ امرا و اراکان دولت تک
وحدت وجود کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عین السلطنۃ مہاراجہ مدار المہام
بہادر دامِ اقبال اس سرمدی مذہب کے ولدِ ادہ۔ اور معرفت کے جویا ہیں۔ لہذا
خدا کو بھی منظور ہوا کہ نفی و اثبات کا جلوہ دکھا دے۔ یہ صفت ۛ لا ۛ کا جو شش تھا
جس نے ایک عالم کو غرق کر دیا۔ اور اب اُس کے بعد اثبات ہے جبکہ منتظمان
رعیت کمیٹی اُجڑے کھنڈروں پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ اور اعلیٰ حضرت سکند
حشت کی فیاضی بھوکوں کو کھانا اور تنگن کو کپڑا دینے میں فراخ حوصلگی کے جوہر
دکھا رہی ہے۔

ضد

اخلاق والے کہتے ہیں کہ ضد بُری چیز ہے۔ بچوں کو بچپن ہی سے تعلیم
دی جاتی ہے کہ ضد نہ کرنا ورنہ لوگوں کو تم سے نفرت ہو جائے گی۔ بے شک کسی
حد تک یا کسی محل پر ضد بُری بھی ہے مگر ہم تو اسے بُرا نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو اس بلا
کی چیز ہے کہ اس کی تکلیف میں بھی ایک مزہ ہے۔ اور ہم تو کسی کی ضد ہی کے
بارے ہوئے ہیں۔ جس کے ہاتھوں عدوموں پر صدمے اور تکلیفوں پر تکلیفین
اُٹھاتے ہیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ ضد بُری چیز ہے۔ ایک دفعہ ناکروسی تو
قیامت آ جائے۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے مگر زبان سے ہاں نہیں نکلتی۔
کبھی کسی کی چڑا رزو التجا پر کہہ دیا تھا کہ ”نہ آئین گے“ اب آپ جاہلینِ حریں یا
جنین۔ اُٹھیں پر انہیں۔ جب کہا تو یہی کہا کہ ”نہ آئین گے“ گویہ ضد ہے۔ گو
پہٹ ہے۔ گو اس سے صہا دل خون ہو گئے۔ گو اس نے لاکھوں آرزو مین خاک میں
ملا دین۔ مگر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ”بُری ہے“ سرگز نہیں جس طرح دل پُر ارمان یار کو مشق

سبحانہ کا ولدادہ ہے اسی طرح وہ جسے اس ولربا عند سے صدمہ پہنچتا ہے
 "بے رنجی جانان کے مزے لے لے کے بار بار کہتا ہے کہ پھر اسی طرح ایک
 بار نہیں کہہ دوں قربان نگاہ تو شوم باز نگاہ ہے۔

مگر اب محفل عشاق سے نکل کے فلسفیانہ تدقیق و تحقیق کی دنیا میں آؤ تو
 یہاں بھی تھیں یہی مند جسے اخلاق والے برابرتاے بین ذہن نظر آئے گی۔
 ایک بڑا نامقولہ ہے کہ "اَلْاَیْمَةُ لَا تَعْلَمُ اَهْلًا وَآلًا" (سب چیزیں
 اپنی عندون سے پہچانی جاتی ہیں) یعنی اُن کی مخالفت چیزوں کے مقابلہ سے
 اُن کی اصلیت و حالت معلوم ہوتی ہے۔ غور سے دیکھو تو نظر آئے گا
 کہ یہ کس قدر سچا اور کس قدر وسیع و عام اصول ہے۔ ایسا اصول کہ شاید
 عالم بالاسے عالم اسفل تک کوئی مقام کہیں جہاں اپنا جلوہ نہ دکھارہا ہو یہ
 سامنے کی باتیں تو ہمیشہ سنی جاتی ہیں کہ گرمی سے سردی اور خشکی سے ترسی
 معلوم ہوتی ہے۔ فوق کو تخت سے دابنے کو بائیں سے۔ اور آگے کو
 پیچھے سے لوگ صرف باہمی مند اور مخالفت کی بنیاد پر امتیاز کر سکتے ہیں۔
 اسی طرح گورے سے کالے اور نور سے ظلمت کی کیفیت کھلتی ہے۔ مگر
 غور کرنے والے انھیں انداز کی حالت معائنہ کر کے بہت دور تک پہنچ
 سکتے ہیں۔

زرتشت نے اپنے مذہب کی ابتدائی بنیاد ہی اس اصول پر قائم
 کر دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا عربی مقولہ ہی ایک فرشتہ بن کو
 اُس کے سامنے آگیا۔ یا خود یہی اصول ایک وحی زبانی کی شان سے اُس
 کے سینے میں چمک اُٹھا۔ اور اُس نے نور و ظلمت کی باہمی ضد پر مذہب
 کی عالیشان عمارت بنا کے کھڑی کر دی۔ اس خیال نے اُسے یہاں تک
 اپنا کلمہ گو بنایا کہ اُس نے اپنے خدا بھی دور کر لیے جو ایک دوسرے کے
 دشمن ہیں۔ اور جنھوں نے بازی گاہ قدرت کے اکھاڑے کو اپنی لڑائی
 اور عمر کے ہمراہی کا دلگل بنا رکھا ہے۔ کیونکہ دن اُس کے عقیدے میں مظہر
 یزدان ہے جو نور محض ہے اور رات مظہر اہرن ہے جو ظلمت صرف ہے۔

دن کو یزدان کا اہرمین پر غلبہ ہوتا ہے اور رات کو اہرمین کا یزدان پر قیامت کو یزدان اہرمین پر غالب آئے گا۔ نور ظلمت کو شکست دے گا۔ اور اُس وقت یزدان اہرمین کو قتل کر کے پیر دین اہرمین یعنی کافروں اور منکران یزدان کو سزا دے گا۔ لہذا اس انجام سے بچنے کے لئے انسان کو یزدان کی پرستش اور اُس کے راضی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

مگر یہ ثنویت (دو خدا ماننا) دیندار ہی کی خالص روحانیت اور حق پرستی کی توحید میں کچھ ابھی نہیں معلوم ہوتی۔ دیگر ادیان و ملل نے بھی اگرچہ شیطان کو مکر و مصدر شر بلکہ شر محض قرار دے دیا ہے۔ اور اُن سب کے نزدیک عالم بالالین بھی دوزخ و جنت ایک دوسرے کی ضد میں موجود ہیں۔ مگر اُن دو دین کی مخالفت کا کوئی اثر خالق حقیقی اور اُس وعدہ لا شریک کی ذات نے ہمتا پر نہیں پڑتا۔ شیطان بھی اگرچہ اُس صفت علی اور بزم لاہوتی کا نکال لاہو اسے اور کہہ رہا ہے مع یزدان نہیں یہ دین کے نکالے ہوئے تو ہیں اور جنت و دوزخ گو اسی سر دشتان میں ہیں لیکن دراصل دنیا والوں اور اسی ظلمت کدے کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہیں والوں کے لئے ہیں۔ خدا کی خدائی میں کوئی نہیں شریک۔ خلاصہ یہ کہ موحدون نے اگرچہ اہرمین سا برابر کا خدا نہیں مانا مگر شیطان کو خدا ہی کا ایک مخلوق تسلیم کر کے کسی گنہگار بندے کی طرح اول درجہ کا متغنی و بدکار اور بدکاریوں کا داعی و حامی تسلیم کر لیا۔ اور وہ احدیت کی شان ضرور قائم رہی۔

اصل یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا کارخانہ فقط ضد میں چل رہا ہے۔ یہ عناصر جن سے ہماری اور ساری دنیا والوں کی تخلیق ہوئی ہے باہم ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مگر اسی دشمنی کے ساتھ اُن میں اتنا عقیدہ بھی آگیا ہے کہ کبھی ملتے ہیں اور کبھی لڑ پڑتے ہیں۔ کبھی ساتھ بیٹھتے ہیں اور کبھی پٹخ جاتی ہے۔ یا تو ایسا اُلٹ نظر آتا ہے کہ بے ساتھ بیٹھے چین نہیں آتا۔ اور یا ایسی وحشت و نفرت کہ ایک دوسرے کی صورت سے بیزار۔

اور جب اُنہیں مین جو مخلوقات کا خمیر مین باہم ایسی ضد واقع ہوئی ہے تو اُن چیزوں مین کیون نہ ہونے لگی تھی جو اُن سے بنی ہیں۔ یہ ایسی کا طفیل ہے کہ مخلوقات ارضی پر جب نظر ڈالو گے تو نظر آئے گا کہ ایک دوسرے کو کھائے جاتا ہے۔ موالید فلاں ہی کو دیکھو۔ جمادات بناتات اور حیوانات کے باہمی تعلقات کیسے ہیں؟ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک کے فنا ہونے پر دوسرے کی زندگی ہے۔ اور گویا اُن مین سے ہر ایک اسی کوشش مین لگا ہوا ہے کہ دوسرے کو فنا کر دے۔ بناتات کا تئذ یہ جمادات سے ہے۔ اور حیوانات کا تئذ یہ بناتات سے۔ بناتات سارے جمادات کو اپنی طرف جذب کئے لیتے ہیں۔ اور حیوانات سارے بناتات کو ختم کئے ڈالتے ہیں۔

ان کی اس ضد سے درگزر کے اب ذرا حیوانات کی اندرونی حالت کو معائنہ کرو۔ اُن کو باہمی تعلقات سب سے زیادہ نمونہ جمادات ہیں۔ جو ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ذمی الارواح چاہتے ہیں کہ اپنی نوع کے سوا اور کسی نوع کو باقی ہی نہ رہنے دیں۔ کہا جاتا ہے کہ چوپاؤن مین درندے اور طیور مین شکاری چڑیاں اپنے شکار کی تلاش مین رہتی ہیں۔ لیکن تال سے دیکھو تو ہر حیوان درندہ ہے۔ اور دوسرے ذی روح کا دشمن۔

حیوانات مین سے انسان اپنے آپ کو بہت بڑا مہذب و شائستہ تصور کرتا ہے مگر اُس نے اس بارہ خاص مین سب کے کان کاٹ لئے اس تہذیب کے ساتھ خدا کی خدائی نہ ایسا دست تصرف دراز کیا کہ درندوں کی وحشت اور شکاری چڑیوں کی بے رحمی سب پیچھے پڑ گئیں۔

خلاصہ یہ کہ ضد مخلوق کے خمیر مین ہے۔ اور بغیر باہمی ضد کے کسی کا کام نہیں چل سکتا۔ ضد نہ ہو تو ہم زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ نہ بڑے بھلے مین امتیاز کر سکتے ہیں۔ اور نہ قدرت کا یہ کارخانہ چل سکتا ہے۔

دولت حسن - آواز

کیا ہو سکے مقابلہ مڑگان یار کا؟
دل ایک ہاتھ کا ہے جگر ایک لڑکا

دنیا میں تین بڑے چلتے ہوئے جا دو ہیں۔ دولت حسن اور آواز
اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں میں سے زیادہ چلتا ہوا جا دو کونسا ہے؟
سب سے پہلے دولت کو لیجئے اور اس کی تعریف سنئے۔ ایک
زمانہ شناس شاعر کہتا ہے اور خوب کہتا ہے۔

لے زرتو خدائے و لیکن بخدا
شارعیوئے قاضی الحاکم جاتی
دولت کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ عایشاں محل
یہ سر ہنگام عازتین۔ یہ مرصع قصر دیوان۔ اور یہ سنت نئے تکلفات دولت کے
کرشمہ بین۔ انگون لے مانا ہو یا نہ مانا۔ مگر اب تو اس کے ماننے میں کسی کو تامل
نہیں کہ ”دولت عزت ہے“ اور یاروں کو تو اب عشق بازی بھی دولت
ہی کا کھیل نظر آتی ہے۔ یہ تھا دولت کا طلسم جس سے سارا جہان گھرا
ہوا ہے۔ اور یہ ہے دولت کا سحر جو کل عالم پر چلا ہوا ہے۔ دولت
کی تعریف تو ختم سن چکے اب حسن کی معجز نائی و سحر طرازی ملاحظہ ہو۔ اس
کے کرشمے ماشار احمد اُن کا کہنا ہی کیا کہ جس کسی کو ان کرشموں کا پسکا
پڑا مرنے کے بعد بھی نہیں جاتا۔ ہائے

قاتل کو زیر قبر بھی دیتے رہے دعا
سہر جا کے بھی نہ جائے یہ سرواہی اور ہی
ادھر کوئی پیارا پیارا حسین چہرہ نظر کے سامنے ہوا۔ آنکھوں کے دلہ وز
تیر چلے اور ہم کلیجہ تمام کر رہ گئے۔ سچ ہے
جس کو تاکا اُسے بے موت ہی مارا ظالم
چوکتا ہی نہیں دامنہ نشاندہ تیرا
کسی ناز آفرین کی دلربا یا نہ خرام ناز کا تماشہ دیکھتے ہی دل ہے کہ پسا جاتا
ہے اور پامال ہونے ہی کو معراج خیال کرتا ہے۔ کسی ملاکٹ فریب ناز نہیں
لے ابھی ہمارے طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھا ہے اور صرف وزویدہ نظر بازی

ہی ہو رہی ہے کہ بے ساختہ نگاہیں بول اٹھیں وہ بے لیا دل۔ کوئی
کا فرما جبراً ہمیں دیکھ کر ہنسا اور یہاں دل پر سجلی گر پڑی کوئی ستم آشنا کالی
دے بیٹھا اور ہم نے دل نہ رکھ دیا۔ کسی عروش مہجین نے ایک غلط
انداز نظر ہم پر ڈالی اور دل بے قابو ہو گیا۔ اس ادا پر مرے۔ پھر کسی
لے پیاری پیاری الفت بھری نگاہوں سے ہمیں زندہ کرنا چاہا اور ہم
زندہ ہو گئے۔ دنیا میں جتنے فتنے اُٹھتے ہیں سب حسینوں کی آنکھ کی بدولت
اور جتنی قیامتیں برپا ہوتی ہیں انہیں کے خرام ناز کے طفیل۔ حسن کی یہ
گر شہ ساز سی جو آپ نے ملاحظہ فرمائی اُس وقت کی ہے جب خوش
قسمتی سے دولت ویدار میسر ہو اور پیارا ناز آفرین چہرہ نظر کے سامنے
ہو لیکن حسن میں یہ اعجاز بھی ہے کہ غائبانہ طور پر بھی اپنا وہی اثر کرتا ہے
جو رو نمائی کی حالت میں۔ ہاں۔

نہ تنہا عشق از دیدار نمیزد بسا کین دولت از گفتار خیزد

یہ وہ ہے کہ پاک طینت و صاف باطن صوفیوں اور اہل اہد بزرگوں نے
انہیں کی پیاری نازنین صورت کو منظر قدرت جان کے جوش و خروش
کے ساتھ کہہ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے قدرت صالح یہ ہون نثار ہنہ تھک بٹھا کے
سامنے یاد خدا کریں۔ القصہ یہ ہیں حسن کی جادو اثری و معجز نمائی کے
نمونے جن پر آپ ابھی ابھی ایک غلط انداز نظر ڈال چکے اور دین و
ایمان کھو چکے ہیں۔ اب آواز اپنی زبانِ حالی سے عرض کرتی ہے۔

ناتوا بیل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر اب جگر شام کے بیٹھو می باری آئی
آواز بھی دراصل ایسا زبردست و موثر جادو ہے کہ سخت سے سخت اور
پتھر سے پتھر دل کو بھی اپنی د لگدازی و سحر نمائی سے نرم کر لیتا اور موم
کر کے پگھلا دیتا ہے۔

کسی کی دلربا شیریں آواز سُنی اور دل بے چین ہو گیا۔ کہیں سے کسی
کی باڈرا اور شہیلی آواز کا نون مین آئی اور بے اختیار اُسی طرف ہمارے
قدم اُٹھنے لگے۔

اسی آواز کا دوسرا اثر دیکھتے ہی کسی آفت رسیدہ اور غم دیدہ کی دروہری آواز کو سنا اور دل تڑپ گیا۔ کسی بھوان نصیب عاشق کے کراہنے اور دلدوز آہین بھرنے کی صدا آئی اور بے ساختہ آسنو نکل پڑے۔ کسی شوخ سنگد کے منہ سے ہنسنی نکلی اور ہم مر گئے اور کسی کے نرم و نازک جان بخش لبوں سے ”ہاں“ کا دلخوش کن۔ وح پرور لفظ سنا اور جی اٹھے۔ جان باختہ عاشقوں کا مارنا جلانا بڑی مثال مشوقوں کی میما صفت آواز کا ایک معمولی کرشمہ اور ادنیٰ مزہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ لفظیہ جگر عاشقوں کے پاس صرف یہی ایک آلہ ایسا ہے جس سے یہ بڑے سے بڑے سخت دل اور نامہربان دلبون کو آخر کار رام ہی کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ آواز اگر اس کا انہیں سہارا نہ ہو اور یہ امید اُن کے دل میں باقی نہ رہے کہ ہماری آہ و سوز کبھی تو کسی کے چہرہ دل میں ناسور کر کے ہماری جگہ نکالے گی تو ہشکل اُن کی حیات کا یقین کیا جاسکتا ہے۔ اُن کو دل میں یہ خیال بوٹوٹا جاگزین ہوتا ہے کہ کبھی تو پھینچ لائے گی انہیں کو بر غیاث تک کہ مدت سے ہماری خاک دانگی بھرتی ہے دولت! حسن! اور آواز! تینوں کے حسن صورت کے کرشموں کو تو تمنا خوب دیکھ چکے اب اُن کے حسن سیرت پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال جائے تاکہ موازنہ بہ ہمد وجہ مکمل و قابل تسلیم ہو۔

دولت کی سیرت یہ ہے کہ کسی جگہ مستقل قیام نہیں۔ ادھر آئی ادھر گئی۔ نیت نئے رنگ بدلتی ہی رہتی ہے۔ بس کسی کے تلوں کی طرح اس کی غیر مستقل مزاجی کا زمانہ شاکی اور اس کی بے وفائی کا ایک دلچسپ نقشہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید کے پاس بہلول دیوانہ گیا خلیفہ کو متفکر و پریشان دیکھا۔ سبب تفکر پوچھا۔ جواب ملا کہ ”دینا اور دولت کی بے وفائی دوسروں کی کا خیال ہے“ بہلول نے کہا ”تم کو اس کی کچھ فکر نہ کرنی چاہئے اس لئے کہ اگر دولت و جہان کو ثبات و قیام ہو تا تو یہ بادشاہی تم تک نہ پہنچتی“ سچ یہ ہے کہ دیوانہ نے بڑی ہی

پتہ کی بات کہی اور خوب کہی۔ ایک فطرت شناس اور زمانہ کا تیا من ہندی شاعر کہتا ہے اور کس قدر سچ کہتا ہے؟

یہ عشرت و عیش و کامرانی کب تک عشرت بھی ہوئی تو نوجوانی کب تک
یہ بھی ہو اگر قیام دولت سے محال دولت بھی ہوئی تو زندگانی کب تک؟

ہمارے محذوم کمزور اور جادو نگار ادیب و سحر طراز مولینا شتر نے اپریل ۱۹۱۷ء کے ”دولتداز“ میں ”دولت“ پر جو قابل قدر و بیش قیمت مضمون لکھا ہے اس میں ایک جگہ دولت کی بُرائی کرتے ہوئے یہ غضب کے چبوتے ہوئے فقرے لکھے ہیں جن کو ہم بھی اپنے قول کی تائیدی شہادت میں نقل کرتے ہیں:-

”روپیہ اگرچہ اُجلا اور روشن ہے اور ظاہر میں کسی حسین کا گورا چہرہ نظر آتا ہے مگر اس میں ایک ایسی سیاہی بھی ہے کہ اگر دیر تک ہاتھ میں رکھو تو ہاتھ کالے ہو جاتے ہیں۔ یہی کالک اگر احتیاط نہ کی گئی تو ہاتھوں سے بڑھ کے منہ میں لگ جاتی ہے اور دولت مندوں کی صورت ایسی بنا دیتی ہے کہ سوا غر من والوں کے کسی کو جعلی نہیں معلوم ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر اور نمایاں کرشمہ دولت کی دور مٹی حالت کا نہیں نظر آسکتا۔ اگر اہل عالم کی فوضین دولت والوں سے نہ ملتی ہوتیں تو شاید ان سے بُرا کوئی نہ ہوتا اور کسی گروہ کی اتنی مذمت نہ کی جاتی جتنی کہ دولت مندوں کی۔ مگر دولت ایسا جادو ہے کہ اپنے مالکوں ہی کو خراب اور بد صورت نہیں بناتا بلکہ گرد و پیش کے تمام لوگوں بھی جھوٹا۔ خوشامدی ذلیل اور سفلہ بنا دیتا ہے۔“

حسن کی سیرت کی یہ حالت ہے کہ حجاب سے زیادہ زندگی لے کے دنیا میں نہیں آیا۔ پوری طرح ابھی ہلک جھپکی بھی نہ تھی کہ رُخ زیبائے یار میں دو کشش اور جذب مقناطیسی ہی باقی نہ رہا جس پر ہم سو جان سے فدا تھے اور جس کی ایک ایک ادا پر سو سو بار اپنا دل قربان کئے دیتے تھے آواز کی سیرت بھی دولت اور حسن کی سیرت سے بالکل ملتی جلتی ہوئی

ہے۔ یہ سچی بات اور قطعی سبب ثبات و فانی کسی نے سرمہ کہلا دیا اور گئی گزری ہوئی۔ کسی نے سیندور دے دیا اور بس غارت گئی۔ غرض۔ ع

دنیا بیچ است و کار دنیا ہمہ بیچ!

مقتدر ناظرین دنگل از! آپ ان تینوں سحر و ن کی صورت اور سیرت بخوبی دیکھ چکے اب محاکمہ اور موازنہ کا ٹھیک وقت ہے۔ ہماری رائے میں سیرت کے لحاظ اور اخلاقی نظر سے یہ تینوں جادوؤں میں جگہ دینے کے لائق نہیں ہیں اور ان کی بے ثباتی و فانی ہم سے تاکید کرتی ہے کہ کبھی سہول کر بھی ان کی طرف رخ نہ کریں۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنی محبت کا پاک و امن ان سے بچاتے رہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ حُسن کو اور نوجوان پر ترجیح ہے۔

دولت بے شک جادو ہے مگر اندھا جادو اور حسن کے آگے محض بے حقیقت اور ناجیز۔ حسن بھلے خود ایک دولت ہے اور ایسی دولت کہ دنیاوی دولت و خزانہ اور مال و متاع اُس کے آگے کمتر و بیچ ہے۔ حسن میں یہ مقناطیسی کشش موجود ہے کہ دنیا کا بیش قیمت خزانہ۔ گران بہا دولت اور انمول سرمایہ اگر چاہے تو دم بھر میں اپنے گرد کھینچ سکتا ہے۔ حسین دونوں جہان کو اپنی رونمائی میں مانگے تو بھی صاحبِ ذوق کہہ اٹھے گا کہ

”نرخ بالا کن کہ ارزانی مہنوز“

اب رہا حسن اور آواز کی جادو اثری و سحر سازی کا موازنہ۔ یہ ذرا مشکل اور بظاہر تیز ہی کھیر معلوم ہوتا ہے مگر غور کرو اور دل میں سوچو تو کچھ ایسا مشکل و اہم بھی نہیں۔ آواز کو دولت پر ضرور ترجیح دی جا سکتی ہے لیکن حُسن پر نہیں۔ کبھی نہیں۔ حشر تک نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آواز بڑا موثر جادو ہے لیکن ہم دو تین وجہوں سے حسن کو آواز پر ترجیح دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق بہ جانب ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آواز کی تاثیر اور سحر سازی بے ہم اُسی وقت تک

آفاکل ہیں جب تک کہ وہ ہمیں اپنا دلنواز نغمہ سنائے جائے اور جس وقت تک ہمارے کانوں میں اپنا دلکش صُور چھو نکلتی رہے لیکن جہاں اس کی یہ صورت قائم نہ رہی وہاں اس کی دلکشی و سحر منائی بھی تشریف لے گئی۔ برخلاف اس کے حسن میں یہ سحر منائی موجود ہے کہ ظاہر و باطن دور و نزدیک قربت میں فرقت میں۔ اور موجودگی میں یا غائبانہ طور پر اپنے جلوہ کا یکساں پر تو ہم پر ڈال دیتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حسن کے پاس متاعِ دل و جان لوٹنے کے لئے جتنے اسلحہ موجود ہیں اور جیسے حربے ہمیں رنجی کرنے کے اُس کے پاس ہیں اُن کے عشرِ عشرِ جی آواز کے پاس نہیں۔ خلاصہ یہ کہ حسینوں کی ہر ادا ایک جہیزِ ان کی ہر اک بات میں ایک باہتِ چال ہے۔ نقرہ جو۔ دم جو۔ گھاس ہے

آپ ہی الصفات فرمائیے کہ آواز کے پاس بھی یہ جوشِ رُبا اسلحہ موجود ہیں اور یہ دل چھین لینے والی باتیں اور دلکش ادائیں اُسے بھی آتی ہیں؟ غالباً آپ کے پاس یہی جواب ہو گا ”نہیں“ بس پھر کیا ہے ”وہ مارا“ اصل یہ ہے کہ ازل ہی سے کاتبِ تقدیر نے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ ورنہ نہ یہ چمکتی جو حسن کی تفسیر ہے کیون تیر ہی چاند سی جبین بنتی

انہیں حور و فلِ حسینوں اور مہ جلال و لرباؤں کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ بزمِ دنیا سخی قابلِ جنتِ خوب بنتی اگر یہ بین بنتی

شاید دنیا میں کوئی اہلِ دل تلاش کرنے سے بھی ایسا نہ ملے گا جو ہمارے اس بے لگا و فیصلہ پر غور و نظر مند نہ ہو لیکن ممکن ہے کہ بعض بے حس و طبیعت اس تعلیٰ و قابلِ تسلیم فیصلہ پر ناک بھون چڑھائیں اور کوئی اعتراض کریں اس لئے اُن کی تسلی و دجوئی کے لئے ہم صاف کہہ دیتے ہیں۔

ان شوخ حسینوں یہ جو اہلِ نہیں ہوتا کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا اگر اس پر بھی اُن کی شکین نہ ہو تو پھر ہمارا اور اُن کا فیصلہ قیامت کے دن ہو گا اور ضرور ہو گا۔ دکھا دیں گے اے معترض روڈِ حشر ہا کہ ساری خدائی گدہر ہو گئی۔

راقم سید نظام الدین شاہ ولیکر اکبر آبادی

نور



ابن القراق شلمانی

طل و عمل کی کتابوں میں اگرچہ ایسے بہت سے فرقے بنائے گئے ہیں جو اسلام کے اندر پیدا ہوئے مگر بھی بعض فرقوں کا ذکر رہ گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک طرف سکہ امامت اور دوسری طرف فلسفہ یونان کی کتابوں کے ترجمہ ہونے اور نیز مسائل کلامیہ میں بحث ہونے کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں کے بعد سے کئی صدیوں تک یہ حالت رہی کہ ہر سال دو ایک نئے باطنی مذہب ضرور پیدا ہو جاتے۔ جو اسلامی سبک کے لئے ایک فتنہ بن جاتے۔ حسن بن صباح عبد الصمد بن قنوت المہدی المغربی۔ اور اسی طرح کے اور بہت سے لوگ ان فتنوں کی یادگار تھے۔

انھیں لوگوں میں ایک ابو جعفر محمد بن علی شلمانی المعروف بہ ابن القراق تھا جس کے حالات سے ہم اپنے ناظرین کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک خاص شہرت کے ساتھ ۲۲۱ھ سے چند سال پہلے خاص ارض عراق اور سواد بغداد میں یکایک یہ شخص نمودار ہوا۔ اور لوگوں میں مشہور ہوا کہ مدعی ربوبیت ہے۔ اور خدا کا دعویٰ کرتا ہے۔ بغداد کی عقلمند دنیا میں کسی تعلیم یافتہ انسان کی نسبت ایک ایسے اتہام کا لگایا جانا کسی طرح قرین قیاس نہیں تصور کیا جاسکتا تھا۔ مگر اسی ۲۲۲ھ میں چند روز پہلے ایک شخص دعوائے نبوت کر کے اپنے بہت سے ایمان لانے والوں کے ساتھ قتل ہو چکا تھا۔ لوگوں کو دلی سوچھی کہ پیغمبر صاحب

کے معجزات تو دیکھ لئے اب جناب رب الارباب صاحب کا جلوہ بھی دیکھ لیں
ساتھ ہی مشہور ہوا کہ بہت سے لوگ اُس کے مذہب میں بھی داخل ہو گئے۔
جن میں بعض نامی گرامی اور صاحب اثر امرا بھی ہیں۔

اس سے پیشتر مقتدر بامد کے عہد اور وزیر خاقانی کے دور میں بھی
اس شخص کی گزرتی رہی کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ مگر وہ بغداد میں روپوش ہو کے
خاموشی کے ساتھ موصول چلا گیا۔ اور خلافت کی جانب سے بھی اُس کا فتنہ دبستا
دیکھ کے زیادہ تک و دو نہیں کی گئی۔ لیکن اب پھر بغداد میں آ کے اُس نے سر
اٹھایا۔ اور اس کے ساتھ ہی شہرت ہوئی کہ مقتدر بامد کا سابق وزیر اعظم
حسن بن قاسم اُس کا معتقد ہو گیا اور بسطام کے دونوں بیٹے ابو جعفر اور ابو علی
جو امراء بغداد میں تھے وہ بھی اُنہیں پر ایمان لے آئے ہیں تو خلیفہ الراضی بامد
فی نحو اسی سال خلافت عباسیہ کی سند پر رونق افروز ہوا تھا اُس کی گرفتاری کا
تاکیدی حکم جاری کر دیا۔ ابن مقلاہ ابن دنون وزیر اعظم خلافت تھا اُس نے
وزیر امیر مغربی سے توجہ کی تو نے ”پروردگار عالم“ پکڑے گئے۔ گرفتاری
کے ساتھ ہی وہ قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور اُس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو
معتقدین و مومنین کے رقعات و خطوط برآمد ہوئے جن میں لکھنے والوں نے
شلمغانی کو ایسے القاب سے یاد کیا تھا جو سوا خدا کے انسان کی نسبت نہیں
استعمال کئے جاتے۔ وہ خطوط شلمغانی کے سامنے پیش کئے گئے تو اُس نے کہا
”ان یہ خطوط انھیں لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جن کے نام ان میں درج
ہیں“ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے کہا ”میں مسلمان ہوں۔ نہ میں نے خدا فی
کا دعویٰ کیا۔ اور نہ کوئی مذہب نکالا۔ اور ان لوگوں فی اگر میری نسبت ایسے الفاظ
استعمال کئے تو یہ اُن کی غلطی ہے۔ جس کا الزام مجھ کو نہیں دیا جاسکتا۔“
انھیں خطوط کی ہینا پر اُس کے دو معتقد بھی گرفتار کئے گئے جو بغداد کے
معزین میں سے تھے۔ ایک ابن ابی عون۔ اور دوسرا ابن عبدوس۔ اب
یہ دونوں شخص اور خود شلمغانی الراضی بامد کے دربار میں پیش ہوئے۔ خلیفہ نے
دونوں مریدوں کو حکم دیا کہ ”اگر تم اس شخص (شلمغانی) سے اپنی برائت ظاہر کرتی ہو تو

دونوں زور زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارو۔ پہلے تو اس حکم کی تعمیل میں ان دونوں کو غدر ہوا۔ مگر جب وہ مجبور کئے گئے تو تیرا وقہراً راضی ہوئے۔ ابن عبدوس نے ہاتھ بڑھا کے اُس کے تھپڑ مار دیا۔ مگر ابن ابی عون نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا اُس کا ہاتھ کانپ گیا۔ اور ساتھ ہی دلی عقیدت کا جو جوش ہوا تو پڑھ کے شلمناخی کی ڈاڑھی کو بوسہ دیا۔ اور بے اختیار اُس کی زبان سے یہ کلمات نکلے کہ ”اے نبی! اوستیدی اور اراقتی!“ (میرے خدا! میرے سردار! اور میرے رازق!) اب کیا تھا؟ راضی باند کو ایک حجت ہاتھ آگئی۔ بولا ”تم تو کہتے تھے کہ مجھے دعوائِ الوہیت نہیں؟ اور یہ کیا ہوا؟“ شلمناخی نے جواب دیا ”ابن ابی عون کے قول کا میں جواب دہ نہیں۔ خدا علیم ہے کہ میں نے کبھی ان سے نہیں کہا کہ مجھے خدا کہا کرو۔ یا میں خدا ہوں۔“ اس پر ابن عبدوس جس نے تھپڑ مارا تھا بولا ”ہاں یہ الوہیت کے مدعی نہیں۔ ان کا تو یہ دعویٰ ہے کہ یہ امام منتظر کے بابے ہیں۔ اور ابن روح کی جگہ میں (جس نے پہلے پہل باب ہونے کا دعویٰ کیا تھا) اور میرا یہ خیال تھا کہ یہ یقیناً ایسا کہتے ہیں۔“

اس کے بعد ابن القزقر شلمناخی کے اصول دین کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی تو عجیب عجیب عقیدے اور انوکھے مسائل ثابت ہوئے۔ مذہب کی بنیاد مرث و مسئلون پر رکھی گئی تھی۔ ایک امامت اور دوسرا تناسخ و حلول۔ الوہیت کی شان یہ تھی کہ خود ابن شلمناخی ہی وہ اللہ الہیت ہے جو حق کو ثابت کرتا ہے۔ وہی ہے جس کی جانب الفاظِ اول۔ قدیم۔ ظاہر۔ باطن اور اترق سے پوری طرح چاہے جن معنوں میں ہوا اشارہ کیا جاتا ہے۔ ذات باری تعالیٰ کی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ وہ احد جل شانہ ہر چیز میں اُس کے خوف و تحمل کے موافق حلول کرتا ہے۔ اور جب کسی پیکرِ ناسوتی میں حلول کرتا ہے تو اُس سے ایسی

سہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ باب کا لفظ اہم ان کے آخری بانی مذہب مرزا علی محمد باب نے پہلے پہل نہیں استعمال کیا بلکہ اُس سے پیشتر بھی یہ لفظ کئی دفعہ کام میں لایا جا چکا ہے۔ تفسیرِ یون میں بھی اس لفظ کا بڑا چارہا ہے۔ ہمارے یہاں لوگوں کا عام خیال ہے کہ بابی فرقہ کے بانی علی محمد باب سے پہلے کسی نے باب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر یہ آئین کی نادانیت ہے۔

قدرت اور ایسے معجزات ظاہر ہوتے ہیں جو اُس کے خدا ہونے کی دلیل ہوتے ہیں دوسرا مسئلہ الٰہی یہ تھا کہ اُس نے ہر چیز کے لئے ایک ضد اس واسطے ظاہر کی تاکہ جس کی ضد ہے وہ ثابت ہو جائے۔ لہذا عند ہی ہر حق کی دلیل ہے۔ اور دلیل حق خود حق سے افضل ہوتی ہے۔ ہر چیز کو ساتھ جو چیز موافق و شاہد ہوتی ہیں بقابلہ اُن کے اُس چیز کی ضد اُس سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اسی کا مظہر یہ ہے کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو جس طرح وہ خود آدم میں حلول کر کے نمایاں ہوا اُسی طرح آدم کے ابلیس یعنی اُن کی ضد میں بھی حلول کر کے خود ہی نمودار ہوا۔ غرض دونوں پیکروں میں خود وہی تھا گو بہ ظاہر دونوں ایک دوسرے کے خلاف نظر آتے تھے۔ پھر جب آدم غائب ہو گئے تو وہ لاہوت (خدا) متفرق و منتشر ہو گئے پانچ ناسوتیوں میں جدا جدا ظاہر ہوا۔ اور اسی طرح ابلیس بھی پانچ ابلیسوں میں منبٹ گیا۔ اس کے بعد لاہوتیت اور یس کے پیکر میں جمع ہو گئی۔ یعنی مکمل خدا نے اور یس میں حلول کیا۔ اور اسی طرح وہ ضد بھی پانچوں ابلیسوں میں سے سمٹ کے اور یس کی ضد یعنی اُن کے مخالف و معاصر ابلیس میں مجتمع ہو گئی۔ اور اُس کے معاصر ابلیس کے بعد پھر لاہوتیت و دونوں ضدوں کی حیثیت سے ناسوتیوں اور ابلیسوں میں منتشر ہوئی۔ اور چند روز بعد۔ قریح اور اُن کے معاصر ابلیس میں جمع ہوئی۔ پھر منتشر ہوئی تو چند روز بعد ہنود اور اُن کے ضد ابلیس میں جمع ہوئی۔ اس کے بعد منتشر ہو گئے صالح اور اُن کے ابلیس یعنی حارثہ بن جمع ہوئی۔ بعد ازاں چند روز منتشر رہ گئے ابراہیم اور اُن کے ابلیس (خردو) میں جمع ہوئی۔ پھر منتشر ہو گئے ہارون اور اُن کے معاصر ابلیس (فرعون) میں جمع ہوئی۔ اب کی جو منتشر ہوئی تو اُس نے سلیمان اور اُن کے ابلیس کے پیکروں کو حلول ہونے کے لئے منتخب کیا۔ اس کے بعد منتشر ہو گئے عیسیٰ اور اُن کے ابلیس میں مجتمع ظاہر ہوئی۔ عیسیٰ کے بعد وہ حارثہ بن میں تقسیم ہو گئی۔ اور چند روز گزر کے جناب علی مرتضیٰ اور اُن کے معاصر ابلیس میں نمودار ہوئی۔ اور اب وہی لاہوتیت خود شلخانی اور اُس کے معاصر ابلیس میں نمایاں ہے۔

شلمغانی کا دعویٰ تھا کہ خدا اپنے آپ کو ہر چیز پر پیکر اور ہر معنی میں ظاہر کرتا ہے۔ اور ہر دل میں جو خیالات گزرا کرتے ہیں اور یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے ہیں یہ وہی خدا ہے۔ خدا دراصل ایک معنی کا نام ہے اور لوگ جس کسی کے محتاج ہوں وہی اُس کا الہ (خدا) ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے ہر شخص خدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جس سے کسی کو نفع پہنچے وہ اُس کا رب ہے۔ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ میں فلان شخص کا رب ہوں۔ وہ میرا رب ہے۔ فلان فلان کا رب ہے۔ اور فلان میرے رب کا رب ہے۔ یہاں تک کہ ربوبیت کا سلسلہ ابن القراقرش شلمغانی تک پہنچ جاتا۔ اور وہ دعویٰ کرتا کہ میں رب اللہ کا رب ہوں۔ کیونکہ اُس کے زمانے میں اُس سے بڑی اور کوئی ربوبیت نہ تھی۔

حضرت علیؓ کی محبت کا غلو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شلمغانی کی تحقیق سے دنیا میں صرف دو خان گزرے تھے۔ ایک موسیٰ اور دوسرے محمدؐ (معاذ اللہ من ذلک) کیونکہ اُس کی اعتقاد میں ہارون نے موسیٰ کو اور علیؓ نے محمدؐ کو رسول بنا کے بھیجا۔ اور دونوں نے رسالت میں خیانت کی۔ اس کے ساتھ زیادہ عجیب یہ بات تھی کہ شلمغانی کے نزدیک جناب امام حنیف اور جناب امام حسینؑ حضرت علیؓ کے فرزند نہ تھے۔ کیونکہ اُس کے اعتقاد کی رو سے جس پیکر میں ربوبیت مجتمع ہو کے نمودار ہوتی ہے اُس کا نہ کوئی باپ ہوتا ہے اور نہ کوئی بیٹا۔ وہ تو خدا ہے۔ اور خدا کی شان ہے ”لم یلد ولم یولد“

یہ تو عقائد تھے اب ذرا ابن شلمغانی کی شریعت کا بانگین بھی ملاحظہ ہو۔ اعتقاد تھا کہ علیؓ نے محمدؐ کو رسول بنا کے کبراہ قریش اور جابرہؓ ع کے پاس بھیجا جنہیں محمدؐ نے یہ حکم دیا کہ رکوع و سجود کریں۔ نماز پڑھیں۔ (غالباً یہی خیانت ہوگی) علیؓ نے یہ دیکھ کے اجازت دے دی کہ جتنے دنوں تک اصحاب کہف سوتے رہے تھے۔ (۳۰ سال) اُنہی زمانے تک محمدؐ کی شریعت ہی پر عمل کیا جائے۔ لیکن اس مدت کے گزرتے ہی وہ احکام سابقہ مسترد ہوں گے۔ اور شریعت بدل کے نئی ہو جائے گی۔ اگر انوس کہ اس مدت کی پورسہ ہونے کو ۳۸ سال باقی تھے کہ دربار لغداد لے وہ اُلویت ہی منتشر کر دی جو مسلمان

شلمانی صاحب کے پیکر ناموسیت میں سے عجیب عجیب آدمیوں میں سے تھی۔ مگر جس قدر مسائل شریعت شلمانی نے بتائے وہ یہ تھے کہ نماز و روزہ کو بالکل چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ تکلیف محمد نے عہدوں کو ان دنوں دی تھی۔ مگر اب جو تکلیف اس زمانہ کے مناسب حال ہے یہ ہے کہ لوگوں کو اپنی عورتوں کو ہر شخص کے لئے حلال کر دینے کی تکلیف دی جائے۔ تاکہ لوگوں کو اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوتے، دیکھیں اور غصہ نہ آئے۔ چنانچہ عورتیں مطلقاً ہر شخص کے لئے حلال طیب ہیں۔ انسان اپنے ذوی الارحام اور عورتیں اب یہ تک کے ساتھ چاہئے تو مقابرت کر سکتا ہے۔ کوئی مفاد فقہ نہیں۔ باپ اپنے بیٹے تک کی عورت سے تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ دین حق والوں (شریعت شلمانی کے پیروں) کو چاہئے کہ ہر شخص جو دوسرے سے افضل ہو اپنے سے کم درجہ والوں کی عورتوں سے حبۃً یہ مقابرت کرے۔ تاکہ ان میں نور کو پہنچا دے۔ اور جو کوئی اس سے انکار کرے گا اس کا جہنم یہ پابندی تو وعدتنا نسخ آنے والے بعد کے دور میں عورت کے پیکر میں ہوگا۔ غرض کہ شہوت پرستی کے رواج دینے میں شلمانی نے مژدک کے بھی کان کاٹ لئے تھے۔

شلمانی کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق جنت و دوزخ کوئی چیز نہ تھے۔ صرف ان کے مذہب حقہ کے ماننے اور اس کی معرفت کا نام جنت تھا۔ اور اس کے مذہب سے انکار کرنے اور اس کے اصول سے جاہل رہنے کا نام دوزخ۔ ملائکہ سے ان کے اعتقاد میں ہر وہ شخص مراد تھا جو عارف حق اور اپنے نفس کا مالک ہو۔

اگرچہ حضرت علیؓ خود بھی ابن ابی طالبؓ تھے مگر چونکہ اکثر ظالمیوں (اولادِ ابی طالب) نے امامت کے دعوے کئے تھے اس لئے ان کے نزدیک تمام ظالمیوں اور عباسیوں کا قتل کرنا موجب ثواب آخری تھا۔ خلاصہ یہ کہ دین اسلام اور خلافت عباسیہ دونوں کے استیصال کا پورا پورا سامان کیا گیا تھا۔ اور جب تحقیق و تفتیش کے بعد یہ مسائل اور عقائد لوگوں کو معلوم ہوئے ہوں گے اور دوبار خلافت میں فقہاء و علما کے سامنے پیش ہوئے ہوں گے تو واقعی بڑا لطیف

آپا ہوگا۔

ان لوگوں کے مقدمہ کی حقیقتات خاص الراضی بامدہ کے دربار میں ہو ا کرتی تھی۔ جن صحبتوں میں لقیہون قاضیوں اور مضنین کے علاوہ سرداران فوج بھی شریک ہوتے تھے آخر فقہانے فتوے دے دیا کہ ایسے بے دین شخص کا قتل کرنا سلطنت کو مباح ہے۔ چنانچہ ابن القراق شلمانی اور اس کے مرید ابن ابی عون جس نے سردار تختیار نے کے عوض شلمانی کی بڑائی کا بوسہ لے کے اسے اپنا حذا اور اپنا رازق بنایا تھا وہ دونوں ۳۲۲ھ کے ماہ ذی قعدہ میں مصلوب کئے گئے۔ اور جب صلیب پر دونوں کی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تو دونوں کی لاشیں اتار کے جلادی گئیں۔ ان کے متبع سجائے اس کے کہ ۲۸ سال گزرنے کے بعد اس دن کا جلوہ دیکھیں جس دن شریعت مصطفوی کو مٹا کے شلمانی کی تصنیف کی ہوئی شریعت مرقنوسی جاری ہونے والی تھی بھاگ بھاگ کے منہ چھپانے لگے۔

شلمانی کا معززیر و حسن بن قاسم رقمین تھا۔ راضی بامدہ نے آدمی بھیج کر اسے بھی قتل کرا دیا۔ اور اس کا سر عبرت روزگار ہونے کے لئے بغداد میں لایا گیا۔ بانیان مذہب یا مذہب میں اندرونی برعین پیدا کرنے والے بہت سے گزرے ہیں مگر ابن القراق شلمانی کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقط پولیٹیکل انٹرگیر یا متحدہ اند خیال کا فلسفی ہی نہ تھا بلکہ اول درجہ کا شہوت پرست بد معاش بھی تھا۔ جس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ دنیا شہوت پرستی اور زنا کاری کا گھر بن جائے۔

—۱۰—

۵۹ ! >

”ہم اور“ تم“ کی داستان ہم ناظرین دگلڈ از کو سنا چکے ہیں۔ اب ”وہ“ کی باری ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور خود میں بھی جو زبان کے نکات و رموز کے شناسا ہیں دعویٰ کر رہے ہیں کہ تین پر سن (اشخاص) ہیں۔ ہم تم اور وہ۔ لیکن غور سے دیکھو تو ”ہم“ ”تم“ ”اب“ سب مل جاتے والے ہیں۔ ایک باقی رہنے والا ”وہ“ ہے۔

لہذا "وہ" ہی اصل ہے۔ اور جو کچھ ہے "وہ" ہی ہے۔

اہل نقوش جوش وحدت میں کہہ اُٹھے تھے "ہم" یا "میں" منصوب کی صدا کی
 "انا الحق" آج تک عارفین کے کانون میں گونج رہی ہے۔ "ہم" میں اگر برائیت
 تھی تو "وہ" میں شریعت ہے۔ ہم "وحدت وجود" تھی۔ اور وہ "وحدت شہود"
 سچ یہ ہے کہ جوش محبت سے بیتاب ہو کے اگر کسی نے "ہم" کا غل مجا دیا تو یہ
 اُس کی بیتابی کا تقاضا تھا۔ ورنہ اصل میں یہ ایک بڑی بھاری غلطی تھی۔ کیونکہ
 جس کو فور محبت سے ہم نے "ہم" یا "تم" کہہ دیا وہ اصل میں نہ "ہم" ہی تھا اور نہ
 "تم" ہی۔ بلکہ وہ "وہ" تھا۔ اور جہاں تک تحقیق و غور سے کام لیجئے وہ ہی وہ ہے۔
 ہم سے اُس سے نسبت ہی کیا؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ہم خاک
 اور "وہ" پاک۔ ہم ظلمت اور "وہ" نور۔ ہم زمین پر اور "وہ" آسمان پر۔ ہم بیان
 اور "وہ" وہاں۔ جہاں کوئی بھی نسبت ہے؟

عالم میں درحقیقت اسی "وہ" نے پہل ڈال رکھی ہے۔ جب تک "ہم" "تم"
 اور "وہ" کی تفریق نہ تھی۔ یہ تشخصات نہیں قائم ہو سکے تھے۔ اور اپنے پرانے کا
 امتیاز نہ تھا۔ اُس وقت تک عجب خموشی سکون و سکوت اور اطمینان و فارغ البالی
 کا عالم تھا۔ مادہ شاکا جھگڑا تھا۔ نہ انانیت کے دعوے تھے۔ اور نہ یہ روز روز کی
 تو تو میں میں۔ وصالِ بخت اور تجر و محض کا سامان تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اُسی وقت
 تک کچھ لطف بھی تھا۔ اگرچہ "وہ" ہی "وہ" تھا مگر ایسا "وہ" کہ مادہ شاکا نے ہونے سے
 اُسے وہ بھی نہ کہہ سکتے تھے۔ اختیار تھا کہ چاہیں اُسے "وہ" کہیں چاہیں "ہم"
 کہیں۔ اور چاہیں "تم" کہیں۔ نہ یہ تھا کہ "ہم" کہہ دینے پر سر کاٹا جاتا ہو۔ اور نہ
 ایسا تھا کہ "وہ" کہہ دینے سے کسی کے نزدیک کا فر قرار پاتے ہوں۔

مگر آہ! اُس غیر متمایز "ہم" اور "وہ" اور "تم" کو اُس خموشی و بیکاری میں
 چین نہ آیا۔ سجد کی تسنن استی میں بچلا نہ بیٹھا گیا۔ طلسم غانہ ہستی کے قفل میں "گن"
 کی کنجی پھری۔ بازگیر قدرت کا پٹارہ کھلا۔ ساتھ ہی "ہم" "تم" کی صورتیں نکل کے
 بیچے آگین اور "وہ" اپنے غرش کے اوپر اس شان سے اور اتنی بلند ہی پر نمودار
 ہو کہ سب مادہ شاکا کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ مگر وہاں دیکھا تو بعد کا دھندھلکا تھا۔

اور یہ ”وہ“ کے چہرے پر نقاب بڑھی ہوئی تھی۔ لیکن اُسی نقاب کی آٹھ سے نور کی شعاعیں نکل نکل گئے ”ہم“ ”ہم“ ”ہم“ کو اپنی طرف کھینچتی۔ اور اُس سابقہ استعادہ کو یاد دلا کے فراق کے صدقات سے بچیں۔ کئے دیتی تھیں۔

اب کیا تھا؟ مشتاقوں کے دلوں میں شوق کا اور زیادہ ہجوم ہوا۔ مذاہب میں ”وہ“ کا دعوے بلند ہوا۔ زہد متاوض نے ”ہو“ ”ہو“ ”ہو“ کا شور مچایا۔ اور اہل ظاہر کا شمار اور کلمہ قرار پایا کہ ”لا الہ الا ہو“ محققین ذوق و شوق میں کہہ اٹھے ”ہو الاول ہو الآخر“ ہو الظاہر ہو الباطن ”عشاق زیادہ بیتاب ہوئے اور کہہ اُٹھے۔

آئے ہیں خیالوں میں دعا گو این دلوں میں پھر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم پر وہ نشین ہیں یہی ”وہ“ ”عربی میں“ ”ہو“ ہے۔ اور چونکہ عربی مذہبی زبان ہے اس لئے ”ہو“ نے ثقاہیت کی شان دکھائی۔ اور عباد و مہذبان میں ”ہو۔ ہو۔ ہو“ کا چرچا ہوا ”وہ“ نے رند از مشرقی کے عالم میں ایسے ایسے مزے دکھائے کہ ”وہ“ کے سوا کسی چیز میں مزہ نہ باقی رہا۔ اس عالم میں جو کچھ ہے وہ ہی وہ ہے۔ اگر آرزوے وصال ہے تو ”وہ“ کی شکوہ فراق ہے تو ”وہ“ کا دل میں بسا ہوا ہے تو ”وہ“ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے تو ”وہ“ بنتی ہے تو ”وہ“ سے۔ بگڑتی ہے تو ”وہ“ سے۔ خلاصہ یہ کہ ہر طرف ”وہ“ ہی ”وہ“ کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔ اور جو کچھ ہے ”وہ“ ہی ”وہ“ ہے۔ ہم ”وہ“ کے لئے ہیں۔ اور ”وہ“ ہمارے لئے۔

ہم پر ”وہ“ کی مہیت اس قدر طاری ہے کہ سوا ”وہ“ کے ہمیں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ طیور خوش تو امین ”وہ“ کی آواز ہے۔ خوشبودار سجھو لون میں ”وہ“ کی جو آواز ہی ہے۔ گل رعن ”وہ“ کے رخسار تابان کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ زنگس ”وہ“ کی چشم نمان ہے۔ سبیل ”وہ“ کی کاکل چچان ہے۔ غرض جس چیز میں دیکھو ”وہ“ کا جلوہ نظر آ رہا ہے۔

اس لئے ”وہ“ اے پیارے ”وہ“۔ ولد ار ”وہ“۔ ناز آفرین ”وہ“ ہمیں بس تو ہی چاہئے اور کچھ نہیں۔ غیر۔ سوا ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ایک ”وہ“ مل جائی تو پھر ہمیں کسی کی پروا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ”وہ“ ”ہو“ ”ہم“ ہوں۔ بلکہ ہم بھی نہ ہوں اور صرف وہ ہی وہ رہ جائے۔

مائل کی آرزو!

نکلی فلک سے کب کسی مائل کی آرزو

پھر اُس پر آرزو بھی میرے دل کی آرزو

”مائل کی آرزو“ اس کے کس قیامت کی آرزو ہے کہ نکالے نہیں مکتلی - دنیا میں یوں تو صدمہ ہا آرزوئیں - ہزاروں تنہائیں اور لاکھوں امیدیں انسان کے دم سے وابستہ ہیں جو ملتے دم تکبہ ساتھ نہیں چھوڑتیں لیکن مائل کی آرزو سب انسانی امیدوں اور تنہائیوں سے بڑھ ہی چڑھی ہوئی ہے جو ملنے کے بعد بھی ساتھ جاتی ہے اور قیامت تک دامن نہیں چھوڑتی - سچ کہا ہے فطرت شناس دلوں سے لے دینا سراسر اے تنگ ہے محشر جو جلتی تنگ عاشق کہان نکال کے دل کی آرزو مائل کی آرزو ہے کیا اور عاشق کی تنہا کہتے کہیں اب اس کو نہ پوچھتے خدا دے تو دے اپنا غم ہر کسی کو کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو عاشق کی تنہا اور مائل کی آرزو کے اظہار میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں مگر ہم اس مختصر مضمون کو اُس کی طوالت کا متحمل نہیں پاتے اور صرف ایک قادر الکلام شاعر کو مندرجہ ذیل مصرعہ کو مائل کی آرزو نظر اہر کرنے کے لئے کافی سمجھتے ہیں - وہ لکھتا ہے ع اشکباری ہے تنہا بے قرار سی آرزو - ہونے کو تو یہ چند لفظوں کا مصرعہ ہے مگر غضب کا جامع اور بلا کا بیض - عاشق کی تنہا کے متعلق آئندہ جو کچھ بھی لکھا جائیگا وہ سب اسی بیخ و بن مصرعے کی شرح ہوگی اور جو کچھ پیشتر لکھا جا چکا ہے وہ بھی اسی معنی خیز مصرعے کی تفصیل و توضیح تھی -

ہو قصہ نفیس یا کہ منسرد
اک شرح ہے لفظ آرزو کی

اس عالم میں جتنی امیدیں - تنہائیں اور آرزوئیں انسان رکھتا ہے اُن میں بیشتر ایسی ہوتی ہیں جو موانعت زمانہ سے اکثر پوری ہو جایا کرتی ہیں لیکن عاشق کی تنہا اس غضب کی نسبت ایک نکتہ دان شاعر اس لطیف پیرایہ میں اشارہ کرتا ہے
چھلنی بنا رہے ہو میرے دل کو تیرے
دیکھو شکل نہ جائے کہیں دل کی آرزو

ہائے ظالم نے کس بلا کا تڑپا دیئے والا شعر کہا ہے اور اس میں فلسفہ آرزو کس
نجوبی سے کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے۔

آرزو اول میں رہنے والی آرزو تو کس ستم کی چیز ہے کہ تیرے ہی جھرو سے بد عاشق
جیتے ہیں اور تیرے ہی نہ نکلنے پر اپنی جان دے دیتے ہیں۔

تتنا اول سے نہ نکلنے والی تننا! تو کس غضب کا چلتا ہوا جادو ہے کہ تیرے سحر کا
مارا ہوا کبھی ہوش ہی میں نہیں آتا۔

صاحبو! یہ بات کچھ کم حیرت ناک نہیں کہ تننا فل شمارنا زمین اور جفا کار مہجین ہم پر
روزانہ ستم توڑتے رہتے ہیں اور نت نئے ظلم ایجاد کر کے ہمیں تودہ مشق ستم بناتا
شدیدہ معشوقی خیال کرتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ ملائک فریب بری جالون کے جو رو
جفا کی مطلق پردہ انہیں کرتے۔ اور عور و شس ناز آفرینوں کے ظلم و ستم کے انگیز کرتے
کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہا کرتے ہیں اور اسی کو اپنی ولی آرزو سمجھتے اور قلبی تننا
سے تعبیر کرتے ہیں۔

خاک کرتا ہے تنافل گرچہ ساری آرزو اُس پہ سچے سے آرزو پیلے ہماری آرزو
غرض جتنی ناکامی ہوتی ہے اتنی ہی آرزو اپنے پاؤں پھیلاتی ہے اور جس قدر حسرت
نصیبی سے واسطہ پڑتا ہے اُسی قدر تنائے ولی عاشق طول پکڑتی جاتی ہے۔
اسی فلاسفی پر نظر ڈالکے حضرت سوسن کہتے ہیں اور کس قدر سچ کہتے ہیں۔

آہ! طول امل ہے روز افزون گرچہ اک دعا نہیں ہوتا

سچ یہ ہے کہ اگر آرزو نہ ہوتی تو حسن و عشق کی دنیا میں وہ رونق اور چہل پہل ہی
نظر نہ آتی جو اب دیکھی جاتی ہے۔ بزم عشق کی شمع کو چراغ آرزو ہی روشن کیا کرتا
ہے۔ سدا آفتاب حسن کی غروب میں بھی عاشق کی تننا کا اسی جلوہ نظر آتا ہے۔ مینوں کی
محفل کی گرم باز اسی اسی کے دم سے ہے اور تفتیہ جگر عاشق کی گرم جوشی
و شوریدہ سری بھی اسی کے قدم سے۔ اگر یہ نہ ہو تو حسن میں دلربائی کی شان وہی
نہ عشق میں زندہ دلی کی آن۔

راقم

سید نظام الدین شاہ دگلہ کریم آبادی

گورِ غریبان

حسرتیں تجھ پر رہتی ہیں تو ہے کس کا مزار
ہے ترے آغوش میں کس موسم گل کی بہار
ٹھہیر مٹی کا ہے پر آئینہ عبرت ہے تو
لے مزارِ عاشق شیدا تر کیا حال ہے؟
کچھ عجیب حسرت اثر اور عبرت افزا حال ہے
کس میر سی سے تری ٹکڑے ہوا جاتا دل
کہہ تو آؤ آغوشِ تربت اکون ہی تجھ پر نہان
وہ مست کش کون تھا مہرون غم مخوف نشان
کس کو پہلو میں لے بیٹھا ہے اسے کچھ مزار
بج تربت کا نقشہ دے رہا ہے کچھ نشان
حسنِ عالم سوز تھا اس کا تماشا کے جہان
دلبرِ عنایہ تھا کارِ راحت کا حسن
گوشہ قدِ انہاں تجھ میں ہے وہ کارِ ہنر
وہ قدم سے تھی اسی کے جلوہ گر شانِ ہنر
ہائے ایسا اہلِ حرفتِ دیرِ تربت آج ہے
مختصر سا تو یہاں کس کا ہے اسے تازہ مزار
شمعِ بالین ہے سرِ تربتِ الم سے اشکبار
کس کے باغِ آرزو کا یہ گلِ امید ہے
ناگفتہ گل ہے یہ کس گلستانِ یاس کا
ہے خموشی میں نشان جس کے بیانِ یاس کا
کس کے باغِ آرزو کو توئے ویران کر دیا
ہے تری آغوش میں کس غزوہ کی جانِ جان

کس شہیدِ ناز نے آکر لیا سچے میں تہرار
کس کے مقدم سے ہی تو آباد اوجِ شہتِ غبار
خاک کا تو وہ ہے پر کجینہ حسرت ہے تو
جا بجا سے شق ہے تو کیا یہ تیرا حال ہے؟
ایک موقعِ یاس کا تیرا سراپا حال ہے
تیرے حالِ زار سے منہ کو چلا آتا ہے دل
کوٹنے مایوسِ حرمان کی ہو حسرت کا نشان
بہل شمشیرِ برہ تھا کوئی کیسا نوجوان
کس کی چشمِ ناز کا مقتول تھا یہ جانِ نثار
کیسوں والا یہ تھا کوئی مگر شکِ بتان
اس کا در تھا اہلِ الفت کے لئے بابِ لالان
جلوہ درویشِ دل آرا سے عیانِ تجھ شانِ حسن
جانتے تھے اہلِ حرفت سب جی جانِ ہنر
مانیتے تھے اس کو سارے رمز و اناجِ ہنر
کشورِ تدبیر و اقلیم حکمِ تاراج ہے
لازمو گلِ خون کی شبنم سے کیوں ہیں جو بہار
سبزہ خاکِ لحد ہے جو شمعِ غم سے سو گوار
کس گلستانِ طرب کا غنچہِ حبا دید ہے
ماہتابِ مخمف کس آسانِ یاس کا
ہے قیامتِ خیز عالمِ ہر فغانِ یاس کا
کس کے شادانِ دل کو گنجِ باغِ حرمان کر دیا
گو وہیں تیری ہے کس منور کارِ مانِ جان

تیرے پہلو میں ہے کس ناشاد کا سامان جان؟ کس پر ارمان کا ہوا تو باعث حرام جان؟
 کس کو پشائے گئے سے تو ہوا سے خاکِ نزار گردن شوق و تمنا کا کیا ہے کس کو مار
 سبز و خود رو جویان تو دان گلشن کی چوٹھا لالہ و نسروں جویان تو نشتر کی دان بہا
 پھول بھی تجھ پر چڑا جاتا ہے کوئی دلفگار خندہ گل سے تر از بہان ہے آشکار
 کچھ ہوا سے تربت گریں شیک تو ہر تصویرِ حزن کرتی ہے دل پر از تیرہ عری تاخیر حزن

بدرا زمان۔ کلکتہ

غرائب الجمل

شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر اگرچہ پیشین یاب ہو چکے ہیں مگر ماثم ہوئے
 کے بعد جیسی متعدد ہی دسر گرمی کی زندگی وہ بسر کر رہے ہیں۔ اور سلطنت کی خدمت سے
 سبکدوش ہو کر جیسی قومی خدمت میں وہ بجالا رہے ہیں ویسی زندگی اور ویسی خدمتیں
 خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے۔ نواب صاحب مدوح کی سہیلے میں طبیعت کے
 لوگ بہت کم لہیں گے۔ اس لئے کہ اُن سے بے کچھ کئے نہیں رہا جاتا۔ اور اپنی کوئی
 قیمتی گھڑی بے کار خرچ ہونے دیتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں اُنھوں نے
 خاص ناموری حاصل کر لی ہے۔ اُن کے متعدد سابقہ تصانیف میں سے بعض ایسے
 ہیں جو اپنی علمی تعلیموں کے لحاظ سے مختلف طبقات اور انسانی کے نہایت سودمند
 اور بالکل ضروری ہیں۔

مدوح اپنی کتاب غرائب الجمل کا ایک زمانے سے وعدہ فرما رہے تھے اور
 اُن کے وعدوں نے پہلک میں بے انتہا شوق پیدا کر رکھا تھا۔ بڑے انتظار کے بعد
 وہ کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی۔ اور اُسے سچ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے خیال اور اپنی
 امید سے زیادہ پایا۔ فنِ حمل سے مراد حروفِ ابجد کے ہم وزن اعداد قائم کرنا اور
 اُن کی ترتیب سے تاریخی فائدہ اُٹھانا ہے۔ اس فن میں اس سے پیشتر کوئی کتاب
 اس پایہ کی نہیں لکھی گئی۔ نواب صاحب نے یہ ہے کہ کثیر البعد و تصانیف قدس سر پر

نظر ڈالی ہے۔ اور ان کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جن کو فن مذکور سے کوئی علاقہ بھی نہ تھا۔ زبان اردو کے ماہروں اور فن شعریں ذوق رکھنے والوں کو اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں اب آئندہ کوئی شخص تاریخ گوئی میں اُس وقت تک باکمال نہ تسلیم کیا جائے گا جب تک اس کتاب پر بالاستیعاب نظر نہ ڈال چکا ہو۔

پبلک کو ہمارے شمس العلماء کی سعی مشکور کا بے انتہا شکر گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ اسی متمم کے تصانیف میں جو آئندہ سرزمین دکن میں اردو کی اصلاح کریں گے اور شاید یہی خاک دکن کو جس طرح کہ وہ ابتدا میں اردو شاعری کا منشاء و موطن تھی آئینہ بھی اردو کا مرجع و ماخذ بنادیں۔

ہم نے عدیم الفرستی کے باعث اس کتاب پر حجتہ نظر ڈالی۔ اور اسے نہایت ہی مکمل و مستوع پایا۔ اور نواب عزیز جنگ بہادر کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ صفحہ ۱۳ میں جہان نواب صاحب نے اپنے ماخذوں کی فہرست درج کی ہے ہمیں ایک شبہ بھی ہوا۔ کیونکہ جیسے نمبر پر کتاب "تاج العروس میں جو اہر القاموس امام بیہقی کی تصنیف بتا دی گئی ہے۔ یہ کتاب قاموس کی شرح ہے۔ اور امام بیہقی قرون اولیٰ کے ائمہ تصنیف میں سے ہیں۔ جو مصنف قاموس سہیت پہلے تھے۔ وہ قاموس کی شرح کیونکر لکھ سکتے تھے؟ تاج العروس علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کی تصنیف ہے جو شاہ ولی احمد دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور مصر میں سکونت اختیار کر کے وہاں کے مستند و مشہور علماء میں شمار ہوئے شاید سید مرتضیٰ زبیدی اپنی کے لقب سے مشہور ہوئے تھے۔ غالباً یہ کتاب کی غلطی ہو۔

غریب الجمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ جو ۲۰ x ۲۶ پیمانہ کے ۳۸۸ صفحات پر ختم ہوئی ہے۔ کاغذ کھرا اور گندہ ہے چھپائی واضح و روشن ہے۔ اور تیار سواں مجلد کتاب آئی ہے۔ قیمت تین روپیہ (۳) اُس کی حیثیت کے مناسب ہے۔ جن لوگوں کو اردو زبان کا لٹری مذاق ہو وہ اس کتاب کو جناب مصنف سے عزیز باغ - سلطان پورہ حیدر آباد دکن کے پتہ پر مراسلت کر کے ضرور طلب فرمائیں۔

سوز وطن

ایک تھی سی ۹۶ صفحوں کی کتاب ہے جس میں منشی نواب رائے صاحب نے اپنے تئیں لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پانچ حصے جمع کر دیے ہیں۔ یہ حصے اہل وطن میں وطن کا جوش پیدا کرانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس بے اہتیاہی کے ساتھ کہ جابجا سے باغیانہ خیالات اور اکثریسٹ پارٹی کے مذاق کی بو آتی ہے۔ ہم اس قسم کی بے نتیجہ شورش کے سخت مخالفت ہیں۔ اور ایسی دوستی کو ہندوستان کی دوستی نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اور آدمیوں کو چھانسی پر لٹک جانے پر آمادہ کر دیا تو ہندوستان کو اس سے کیا مل جائے گا۔ خدا ہندوستان کو اپنے نام سمجھ دوستوں کے ہاتھ سے بچائے۔ جنھوں نے اتنے دنوں کی علمی ترقیوں کو خاک میں ملا کر آئندہ کے لئے تعلیم کا بھی سد باب کر دیا۔ قیمت کچھ نہیں صرف ۴۰ روپے۔ زبان اچھی اور سستہ ہے۔ اور طرز بیان موثر۔ جن حضرات کو ایسے لٹریچر کا شوق ہو ایڈیٹر صاحب زمانہ کو کانپور میں خط بھیج کے طلب فرمائیں۔

۳۱

جہنم سے پہلا خط

یہ بھی ایک چھوٹی سی ۲۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ اور قیمت صرف ۲۰ روپے منشی شرف الدین احمد خان صاحب ہیڈ کلرک جیل ریاست رام پور نے انگریزی سے ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔ اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہی ہے۔ اصل کتاب شاید جو میں میں لکھی گئی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مترجم صاحب نے کس مصلحت سے اصلی مصنف کا نام کہیں نہیں بتایا ہے۔ کتاب بچائے خود اچھی ہے۔ کیونکہ یہ لازمہ ہی کی تردید اور مذہب کی حمایت میں ہے اس کا دلچسپ پلاٹ یہ ہے کہ ایک شخص دوزخ سے اپنی حالت اور اپنی بد اعمالیوں کے نتائج کی کیفیت لکھتا ہے۔ ترجمہ کی خوبی واد سے اس لئے مستغنی ہے کہ آنریبل جسٹس سید شرف الدین صاحب جج

ہائی کورٹ کلکتہ نے اصل سے مقابلہ کر کے ترجمہ کو مطابق پایا اور اس کی توثیق کی۔
رہے مضامین ان کی نسبت ظاہر ہے کہ ہمارے بگڑنے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں
کے لئے ایسے تازیانوں کی بے انتہا ضرورت ہے۔

تاہم میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہر قوم اور ہر مذہب اور ہر معاشرت کا ہر امر میں
ایک ایڈیل ہو کرنا ہے جو دوسری قوم اور دیگر مذہب والوں کی نظر میں غیر مانوس
ہوتا ہے اس کا بعد الموت کا ایڈیل مسلمانوں کے ایڈیل سے ذرا جداگانہ ہے۔
اور اسی حد تک مسلمانوں پر اس کا اثر بھی کم ہو گا۔ اس کتاب سے جتنا فائدہ ایک
مسیحی سچہ اٹھا سکتا ہے مسلمان بچہ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر بھی نوجوانوں کو اس کے
مطالعہ کی ضرورت ہے۔ مصنف صاحب کو مذکورہ بالا بت پر خط بھیج کے طلب فرمائیں

قدردانان و گداز

دنگداز کے گیارہ نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور دو جاری روز
میں بارہواں نمبر بھی حاضر ہو گا۔ جو بتا دے گا کہ ۱۹۷۹ء میں دنگداز میں کیسی اصلاح
کی گئی تھی اور جنوری کا پرچہ کس ترقی کے ساتھ نکلے گا۔ مگر اس موقع پر استنا
التماس کرنا ضروری ہے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۹ء کا چند براہ کرم منی آرڈر کے
ذریعہ سے جلد ارسال فرمائیے۔ ہم نے محض اشاعت کی بد نظمی کے خیال سے
اپنی عادت کے موافق کوئی پرچہ دیا۔ پی نہیں بھیجا۔ لہذا اب چونکہ ختم سال ہے
اور دنگداز پوری خدمت بجالا چکا آپ خود ہی چندہ ارسال فرما کر ہمیں منت
فرمائیں۔ تاکہ آئندہ اصلاحوں میں مدد مل سکے۔ اسید ہے کہ ہمارے قدر افزا
احباب ضرور توجہ فرمائیں گے۔

فکسار

محمد فاروق منیر دنگداز



۱۹۰۸ء خدا حافظ! اور سفاک مرزا۔ مرزا۔ لٹال۔ قتال۔ میان جانے والے
جاؤ۔ مگر مین بھول نہ جانا۔ تم سے بس اتنی ہی التجا ہے کہ تمہارے جریدے پر ہمارا نام
ثبت رہے۔ اور میان آنے والے آؤ۔ مگر ذرا غریبوں کا خیال رہے۔ ساری امین
اور کل آرزوئین اب تمہاری ہی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور کامیابی کا تاج پہنچانے
والے یا ناکامی و نام ادا کی گڑھے میں ڈھکیلنے والے جو کچھ ہو تم ہی ہو۔ یہ نہ سمجھو
کہ ۱۹۰۸ء کو جو ہم نے خدا حافظ کہہ کے رخصت کر دیا۔ تو ٹھنڈے کیجے سے رخصت
کیا ہو یہ نہ خیال کرو کہ اس نے ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا تھا۔ اور اب ہمیں
تمہاری مزید عنایت کی ضرورت نہیں۔ نہیں ہم سے زیادہ متقی تعین کوئی نہ ملے گا۔ اگر
مظلوم کے حال پر رحم کرنا اور مصیبت زدہ کو آنت سے نکالنا کوئی اچھا کام ہے تو دنگداز
سب زبازہ اور سب سے پہلے تمہاری عنایت اور تمہارے لطف و کرم کا مستحق ہے۔
ذرا اس کی سرگزشت تو سنو۔ گویا ایک داستانِ غم ہے۔ مگر داستانِ غم ہی
مڑے کی بھی ہوتی ہے۔ اور کچھ ایسی ہی باتیں دل بہن بھی لگتی ہیں۔ آج سے بائیس سال
پہلے جب کہ یہ بیسویں صدی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اور ایک تمہارے مابقی نائب
زمانہ ۱۸۸۵ء کا عمل تھا۔ دنگداز لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کی اُس وقت کی آب و
تاب۔ چمک و دمک۔ اور دلفریبی و رعنائی۔ دیکھنے کے لائق تھی۔ اور اس کی اُس وقت
کی پیشی اور دل میں اُتر جانے والی باتیں سننے کے قابل نہیں۔ اس وقت یہ صفت

۶۶ غون کار سال تھا۔ مگر وہ سولہ صفحہ جن پر فقط عاشقانہ مضامین اور خیال آرائی و خیال آفرینی کے کرشمے ہو کر لے گئے تھے کیا کہیں کہ کیسے بڑے لطیف پُر مذاق اور سراپا سو و گداز ہوتے تھے۔ چند ہی روز میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اور ہر اردو زبان میں مذاق رکھنے والا اس کا دلدادہ و شیداء ہو گیا۔ غرض ۱۸۸۸ء ہر طرح اس کے حال پر شفیق و مہربان تھا۔ اور اس مرحوم سنہ سے کوئی شکایت نہیں۔

یہاں تک کہ ہم نے آنسو بہا ہا کے اُس سنہ کو اذکار کبھی اور ۱۸۸۸ء کا خیر مقدم ادا کیا۔ وہ پہلے مرنے سے بھی زیادہ مہربان ثابت ہوا۔ اُس کے شروع ہوتے ہی د لگداز میں ۱۶ صفحات مضامین پر ناول کے ۱۶ صفحے اضافہ کئے گئے۔ پرچہ دو جز کا ہو گیا۔ اور اس دلچسپ اضافہ سے اس کی محبوبیت و رونق اور بڑھ گئی۔ ہر طرف اس کے لئے دست و شوق پھیلے ہوئے تھے۔ انتظار کی آنکھیں کسی رنگ و نیا کی طرح ہر گزری اس کی طرف لگی رہتی تھیں۔ ۱۸۸۸ء کی مہربانیوں نے اس کی بنیاد ایسی مضبوط و جادہ ہی تھی کہ اُس کے بعد دو سال یعنی ۱۸۸۹ء و ۱۸۹۰ء د لگداز کے لئے شادمانی و کھرازی ہی کے برس رہے۔ ہندوستان میں ہر طرف د لگداز ہی کا چرچا تھا۔ سو وقت نہ کوئی ایسا رسالہ ملک میں جاری تھا جو د لگداز کا مقابلہ کر سکے۔ اور نہ کوئی زبان کا رسایا تھا جسے بغیر د لگداز کی صورتِ زیبا دیکھے جہیں آئے اس کو مضامین کی ہر طرف دھوم تھی۔ اور اس کے ناوال ٹیٹلر پھر قومی جوش اور تار مینی و لفر میوں کے ایسے نمونے تھے کہ ہر زبان پر اُن کا چرچا تھا اور ہر گز میں اُن کا تذکرہ۔ اب ۱۸۹۰ء آیا۔ اور اُس کے ماہ اپریل میں ہمیں پہلے پہل ایک خاص ضرورت سے حیدر آباد و فخذہ بنیاد میں آنا اور نواب وقار الامراہاد کی مہربانیوں سے یہاں رگ جانا پڑا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ د لگداز کی اشاعت رگ گئی۔ نواب وقار الامراہاد اُن دنوں معین المہام مال تھے۔ اور ہم سے اُنہوں نے خواہش کی کہ اُن کے صاحبزادے نواب ولی الدین خان بہادر کی مشرقی تعلیم کی نگرانی کے لئے ولایت جاتیں۔ ہمیں سفر ولایت کے شوق میں پرچہ اور مطبع کو بند کر کے مستعد ہو جانا پڑا۔ مگر جب ہم گھوڑے بھیج چکے تو روانگی کا سانس خیزانہ ہوا پڑ گیا اور ہمارے لئے سو اسوئے کے کوئی مشغلہ نہ تھا۔ اسی لیت و لعل میں جب دو سال

گزر گئے تو ہم نے ناامید ہو کر ۱۸۹۲ء میں لکھنؤ سے پھر دولگداز کو جاری کر دیا۔ مگر اب یہ حالت تھی کہ ہم حیدر آباد میں تھے اور دولگداز لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔ لیکن اسے شائع ہونے صرف ۹ مہینہ گزرے تھے کہ ہمیں یکایک روڈ انگریز انگلستان کا حکم ملا۔ ہم نے حکم ملنے کے پندرہ ہی روز بعد ”بسم ابد مجربیا درسا“ کہا۔ جہاز نے نکل کر اٹھایا۔ اور دولگداز کی کشتی تین مہینہ ہمارے پڑاؤ کے دولگداز کی اور دو سب گئی۔

ولایت سے واپس آنے کے بعد ہم نے ۱۸۹۳ء سے پھر دولگداز جاری کیا۔ لیکن گیارہ پرچہ شائع ہونے پائے تھے کہ جناب سکینہ بنت حسین کی سوانح عمری پر جو دولگداز میں شائع ہو رہی تھی عوام کا لانا میں ایک شورش پیدا ہوئی۔ اگرچہ گورنمنٹ نظام نے اپنی روشنی خیالی سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ مگر پوری طور پر ہمیں مشورہ دیا گیا کہ اس مضمون کے باقی حصہ کو ہم دیکھیں۔ اور اس کی عرض ہم دیگر مضامین شائع کریں۔ مگر ہم اس کے بھی متحمل نہ ہو سکے۔ اور ہم نے یہ کہہ کے دولگداز ہی بند کر دیا کہ جب سکینہ بنت حسین کے مضمون کا باقی حصہ شائع ہوگا تب ہی دولگداز بھی شائع ہوگا۔ اس کے بعد ہم پورے ایک برس حیدر آباد میں رہے اور دولگداز بند رہا۔ ۱۸۹۴ء میں ہمیں نواب وقار الامراہا درسنے اجازت دی کہ جب تک جاہلین لکھنؤ میں رہے ان کے خدمات بجا لائیں۔ چنانچہ ہم لکھنؤ گئے اور سب سے پہلے وہاں پہونچ کے ۱۸۹۴ء کا بارعنوان نمبر شائع کیا جس میں مختصر سکینہ بنت حسین کی سوانح عمری کا باقی ماندہ حصہ تھا۔ اور اس کے بعد جنوری ۱۸۹۵ء سے پھر اشاعت دولگداز کا سلسلہ لکھنؤ سے جاری ہو گیا۔

اب پھر دولگداز اسی آب و تاب سے نکلا۔ اور اس کے مضامین پھر اسی طرح پبلک میں ایک چرندہ دلی پیدا کرنے لگے۔ اب دولگداز کے تاریخی ناولوں نے ملک میں تاریخ کا اس قدر زیادہ مذاق پیدا کر دیا تھا کہ دولگداز میں تاریخ کے ۱۴ صفحات بڑھانے کی ضرورت پیش آئی۔ اور ۱۸۹۵ء سے حروب صلیبیہ کی تاریخ کے شائع کر لینے کا نیا سلسلہ جاری کیا گیا۔ مگر اس کو چھ ہی مہینے گرنے پائے تھے کہ ہمیں حسب حکم نواب وقار الامراہا در مرحوم حیدر آباد آنا پڑا۔ دولگداز کی اشاعت کا سلسلہ پھر ترک کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں صرف پانچ رسالہ مکمل کے ناتمام پڑے رہ گئے۔ اب

حیدر آباد میں رہ کے لکھنؤ سے شایع کرنا ہمیں بہت ہی دشوار اور غیر ممکن نظر آیا۔ ہمارے آنے کے تھوڑے دنوں بعد حیدر آباد کی وزارت میں تئیر ہو گیا یہیں سلطان ہمارا جس سرکشن پر شاہ بہادر ایکہ آرائے مسند وزارت ہوئے۔ اور ہم سلطانہ کے اختتام تک یہیں رہے۔ اُن دنوں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ دولت آصفیہ نظام سے ہمارے تعلقات ہی منقطع ہو گئے۔ ساتھ ہی ہم بھی حیدر آباد سے برخاستہ خاطر ہو گئے۔ اور قطعی ارادہ کر لیا کہ لکھنؤ میں جا کے اپنے پڑا لے مشاغل کا سلسلہ شروع کر دیں۔ اور اگرچہ نواب سلطان الملک بہادر اپنی پانگاہ سے ہماری کفالت کر رہے تھے۔ اور آخر تک کفالت کرنے کو موجود تھے۔ اور یہیں السلطنت ہمارا جہدار المہام بہادر بھی اپنی فیاضی و کریم النفسی سے ہر طرح کا اطمینان دلا رہے تھے مگر ہمیں دگلڈ از کے شایع کرنے اور پھر سیکر زندگی اختیار کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ کل امیدوں کو چھوڑ کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور جو ۱۰ ستمبر ۱۹۰۵ء سے دگلڈ از کو پھر جاری کر کے اُس سال کی شش ماہی سلطانہ کی ناتمام جلد دگلڈ از کو مکمل کر دیا۔ اُس کے بعد ستمبر ۱۹۰۵ء کے اگست میں تاریخ حربہ صلیب مکمل ہو گئی تب میں نے اپنی نالیفٹ کی ہوئی تاریخ سندھ کو دگلڈ از کی ساتھ نکالنا شروع کیا۔ جس کی پہلی جلد دسمبر ۱۹۰۵ء میں پوری ہو گئی۔

۱۹۰۵ء کے اوپر درسی سے دگلڈ از میں مضامین نادل و تاریخ کے علاوہ ایک سوانح عمری کے شایع کرنے کا بھی سلسلہ ڈالا گیا۔ آغا فی صاحب کی لاکھ کے ۸ صفحہ ہر پریم کے ساتھ شایع ہونے لگے۔ اور پرچہ کا پورا حجم ساڑھے تین جزی یعنی ۵۶ صفحوں کا ہو گیا۔ ستمبر ۱۹۰۵ء میں ہم کو اپنی بیماری اور اپنے بعض خاندانی مصدات کے باعث ایسی مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا کہ دگلڈ از کی اشاعت میں پھر فرق آگیا۔ اُن مصدات سے نجات ملی ہی تھی کہ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب مستعد عدالت کو توالی و امور عامہ کے عالمانہ مذاق نے ہمارا جہدار المہام بہادر کو پھر میری یاد دلانی۔ اور مختشم الیہ کی قدر افزائی سے میں بہ جیست روزگار ناظم تعلیمات پھر آباد میں آیا۔ یہاں آ کے جب ذرا اطمینان سے بیٹھنا نصیب ہوا تو وہ اشاعت دگلڈ از کا پڑنا ہوا سلسلہ پھر چڑا گیا۔ دگلڈ از نے اوقات زمانہ سے

پہنچنے کے لئے دولت ابد مدت احمدیہ خلد ملکبارہ کے دامن غایت میں پناہ لی۔ اور جولاہی ۱۹۷۷ء سے دوبارہ جاری کر کے دگلدار کی جو جلد ماہ جون ۱۹۷۷ء میں خاتم پڑی رہ گئی تھی اس کے تکملہ کی کوشش کی گئی۔ اور الحمد للہ کہ ابھی رسالہ پر اس جلد کا تکملہ ہوتا ہے اور جلد مضامین ہی نہیں پوری پوری کر دی گئی۔ بلکہ ناول بھی ختم ہو گیا۔ تاریخ سندھ کی دوسری جلد بھی مکمل ہو گئی۔ اور آغا فی صاحب کی لائف بھی مختصر کر کے مکمل کر دی گئی۔

اب ہمیں مختصر یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ دگلدار نے باوجود اس کے کہ دگلدار کے سنبھلا اور گرگر کے اٹھا۔ اور اس کی زندگی انقلابات عالم کی حشرناک تصویر رہی مگر ان ناکامیوں پر بھی اس نے کتنے کام کئے۔ اور اردو کے خزانہ میں کتنی دلچسپ اور قیمتی کتابیں پیدا کر دیں۔ علاوہ جلد ہائے مضامین کے اس نے ۱۹۷۷ء میں ناول ملک انور اور جتنا مکمل کیا۔ ۱۹۷۷ء میں ناول حسن خیلنا مرتب ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں ناول منصور و موہنا۔ ۱۹۷۷ء میں ناول یوسف و نجمہ پانچ جز شائع ہوئے۔ ناٹام پڑا رہ گیا تھا وہ سولہ برس بعد جنوری ۱۹۷۷ء سے دوبارہ شائع ہوئے۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں مکمل ہوا۔ ۱۹۷۷ء میں ناول فلور انفلورنڈا شائع ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں مکمل کیا تھا وہ ۱۹۷۷ء میں ملحدہ تمام و کمال چھاپ کے شائع کر دیا گیا۔ جولاہی ۱۹۷۷ء سے ناول شوقین مکمل شائع ہونا شروع ہوا تھا وہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں مکمل ہو گیا۔ جنوری ۱۹۷۷ء سے ناول تیس دہائی کی اشاعت کا سلسلہ ڈالا گیا تھا وہ اب دسمبر ۱۹۷۷ء یعنی اسی پرچہ کی اشاعت کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ حروب صلیبیہ اور تاریخ سندھ کی دو جلدیں اور آغا فی صاحب کی لائف اسی دگلدار کے ہاتھوں اردو لٹریچر کے دربار میں پیش کی گئیں۔

اگر انصاف کیجئے تو ان ناکامیوں اور ایسی پریشان حالیوں کے ساتھ دگلدار کی یہ لٹریچر خدائیں تھوڑی نہیں۔ اور باوجود عمر کے بیٹھے اور گرگر کے آٹھ کے دگلدار نے انشا پر وازی کی دنیا میں ایسی یادگارین نہیں چھوڑی ہیں جو کبھی زمانہ کو بھول سکیں۔ اور اردو زبان کے تمام رسالوں میں سے صرف

دگلدار ہی اس دعوے کا مجاز ہو سکتا ہے کہ مع "ثبت" است بر جریۃ عالم دوام
یہ دگلدار ہی کے لئے ہے کہ اُس کے ناولوں کی ہر لغزیزی و مقبولیت اس قدر
بڑھی ہوئی تھی کہ اُن کی اشاعت مطالع کی ہوس اور پبلک کے ہجوم شوق کی
بدولت ہمارے بس اور قابو میں نہ رہ سکی۔ ہمارا کچھ زور نہ چل سکا۔ اور دگلدار
کے کارخانے کے موجود ہوتے ہر جگہ اور شہر کے مطالع نے بلا لحاظ ہمارے
رمزار و رعیت یا ہمارے حیر و اکراہ کے مذکورہ بالا ناولوں میں سے اکثر کو چھاپنا
شروع کر دیا۔ اور اس وقت تک اُن کے میسون ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
اور اب بھی باوجود روکنے اور منع کرنے کے لوگ جگہ جگہ طرح کی چالاکیاں
عمل میں لاکے انہیں چھاپ رہی جیتے ہیں غرض یہ مقبولیت سوا دگلدار کے اور کسی آردو
رسالے کو نہیں نصیب ہوئی۔

تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو دگلدار کی حالت بہت کچھ اصلاح طلب
ہے۔ فی الحال ہندوستان میں متعدد رسالے بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہے
ہیں۔ اُن میں ایڈیٹرون کو سواتالیف کے اور مختلف مضمون نگاروں کے
مضامین جمع کر دینے کے اور کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی ہے۔ اور دگلدار
میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک خاص لٹریچر ہوتا ہے۔ اور اول سے آخر تک (پہلے
چند مضامین کے جو کبھی کبھی شائع ہو جاتے ہیں) سب ایڈیٹر دگلدار کے دماغ و قلم
کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ حالت ہو گئی ہے کہ دگلدار کے
سال بھر کے پرچے مرتب ہو جانے کے بعد چاہے کتنے ہی پُر لطف ہوں مگر ہر
مشرق پرچہ بالکل بے کار اور بے فائدہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ تاریخ۔ ناول۔ اور لائف
تینوں جزوں کے اول و آخر کے اوراق جب تک موجود نہ ہوں درمیان کا
ایک جز کسی کام کا نہیں ہوتا۔ رہا ابتدا کا ایک جز جس میں مضامین ہوا کرتے
ہیں وہ اس قدر محدود ہے کہ اُس پر اچھے اور مکمل مضامین نہیں آسکتے جس کا
نتیجہ یہ ہے کہ کوئی نمونہ کا پرچہ طلب کرتا ہے تو ہمیں درمیان سال کا کوئی نمبر
بھیجے شرم آتی ہے کہ جن صاحب کے ہاتھ میں جائے گا وہ سوا اس کے کہ
ناک بھون چڑھا کے ہاتھ سے پھینک دیں کسی قسم کا لٹری لطف نہ اٹھا سکیں گے

ان فرض یہی نقصانات ہیں مجبور کر رہے ہیں کہ اب دولگداز کی وضع و حالت بالکل بدل دی جائے۔ اور بچے اسے دولگداز کو خیال سے بھلا کے بالکل نیا دولگداز جاری کیا جائے جو چھپائی کے اعتبار سے اچھے ہونے کے علاوہ اس قابل ہو کہ اُس کے ہر نمبر سے ناظرین کو ایک ہر اگانہ لطف آئے۔ اور لوگ اُس کو زیادہ شوق کے ہاتھوں سے لیا کریں۔

چنانچہ اب جنوری ۱۹۰۹ء سے دولگداز کی تقطیع بجائے ۱۸ x ۲۲ کو ۲۶ x ۲۶ کر دی گئی ہے۔ اور مسطر جو کہ ان چھوٹے صفحات پر ۲۵ سطروں کا تھا آئندہ ان ہی بڑے صفحات پر ۲۱ سطر کا رہے گا تاکہ خوب واضح اور روشن رہے۔ تاریخ اور لائف کا سلسلہ اب ختم کر دیا گیا۔ اور ان کے صفحات بھی مضامین کے حصہ میں شامل کر دیے گئے۔ اس طریقہ سے پورے چالیس صفحوں پر مضامین رہیں گے۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مشہور و معروف انشا پردازوں اور جادو نگار محققوں اور فاضلوں کے مضامین کثرت سے شائع کئے جائیں۔ ان مضامین میں ملے ہوئے ایڈیٹر دولگداز کے مضامین بھی اسی مقدار میں رہیں گے جتنے کہ اب ہوتے ہیں۔ ان چالیس صفحوں میں سے ۲۲ صفحوں پر مضامین ہوں گے اور ۸ صفحوں پر ہندوستان کے واقعات و حالات پر دلچسپ ریمارک رہا کریں گے۔ اور ۱۰ صفحوں کے بعد ۱۶ صفحوں پر ایڈیٹر دولگداز کا ایک تاریخی دلچسپ ناول ہو گا۔ اس لئے کہ قدر دانان دولگداز کو بغیر ہمارے کسی ناول کے پورا لطف نہ آئے گا۔ ان فرض آئندہ سے مضامین و ناول ملا کے دولگداز کا حجم ۶۵ صفحوں کا رہے گا۔ کاغذ بھی آئندہ عمدہ ولایتی کر دیا گیا ہے۔ اور چھپائی کے متعلق بھی مزید اہتمام کی کوشش کی گئی ہے۔

پیشتر جو ترقیقین صرف ناول صرف دولگداز صرف تاریخ یا ان میں سے دو حصوں یا مکمل پرچہ کے خریدنے کی تحقین وہ سلسلہ سے موقوف کی جاتی ہیں آئندہ سے پورا مکمل پرچہ دیا جائے گا۔ اور اُس کی قیمت قلمرو برطانیہ میں تین روپے (تین) کھدار اور قلمرو دولت آصفیہ میں چار روپے (چار) سکہ محبوبید رہے گی۔ نہ کسی کو ہر اگانہ ناول دیا جائے گا اور نہ کسی کو ہر اگانہ عمدہ مضامین۔

اغرض اسے سٹولہ عایاد گلدار جسے جسے بہت کچھ ترسیم و اصلاح کر کے اور سابق سے بہت زیادہ مکمل و دلچسپ بنانے کے ہم ترے آغوش میں ڈالتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ تو اسے اپنی یادگار تصور کر کے اس کو ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور تجھے زحمت کرتے وقت ہم اسے بہت حرفی و عرونی کی حالت پر پائین گے۔

ایسی موقع پر قدر افزایان و گلدار کی خدمت میں التماس ہے کہ اس اپنے آغوش شفقت و امن و دروان کے لیے ہونے پرچہ کو آپ محبت شفقت کی نظر سے دیکھیں گے۔ اور خیال کریں گے کہ اس کی ترقیان آپ ہی کی سابقہ کرم فرمائیاں نتیجہ ہیں اور اب یہ پہلے سے زیادہ آپ کے دست شفقت کا محتاج ہے۔

اے وہ بزرگان قوم جو دگلدار کو اپنا اور اپنے آغوش کرمیت کا پروردہ جانتے ہو ایک اور معاملہ میں بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کو یاد رہے گا پرچہ ہر سال پیشگی ویلوپی ایبل روانہ کر دیا جاتا تھا۔ مگر سٹولہ ع میں محض اس خیال سے کہ اشاعت میں بد نظمی ہی ہم کسی صاحب کی خدمت میں وی بی نہیں بھیجا اب چونکہ بارہ پرچے آپ کی خدمت میں پہنچ چکے۔ اور سٹولہ ع و سٹولہ ع میں ملائے ہم نے مضامین و تاریخ و لافٹ کی پوری جلدیں مکمل کر کے آپ کی خدمت میں پہنچا دیں اس لئے اب ہم گذشتہ سال کی قیمت مانگنے کے مستحق ہیں۔

اس گذشتہ قیمت کے لئے ہم پرچہ وی بی تو نہیں بھیجنا چاہتے مگر امیدوار ہیں کہ آپ اپنی عنایت سے اس سہ کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کے کارخانہ کی مدد فرمائیں۔ تاکہ ہمیں اصلاح و ترقی میں مدد ملے۔ سٹولہ ع کے دو پرچہ وقت پر حکالنے کے بعد تیسرا پرچہ یعنی مارچ سٹولہ ع کا دگلدار اسی سٹولہ ع کی پیشگی قیمت پر البتہ وی بی روانہ کیا جائے گا۔ لیکن اس گذشتہ سال کی قیمت کے متعلق ہمیں آپ کی عنایت، مہربانی شفقت اور قدیم مہربانی گری سے اسد ہے کہ ہمارے بلا طلب آپ ارسال فرما کے ہمیں ہمیشہ کے لئے ہمیں منت فرمائیں گے۔

اگر کوئی صاحب آئندہ خرید اسی کے متعلق متذہبوں تو جنوری ۱۹۰۹ء کا پرچہ دیکھ کر اسے قاسم فرمائیں۔

عمر عیار

اُردو جاسنے والوں میں سے بہت کم ہوں گے جو اس نام سے نا آشنا ہوں۔
 و استان گویوں نے اور امیر خرمہ کی داستان کے مصنفوں نے اس نام کو ایک ایسا
 با مذاق اور عجیب و غریب کیریکٹرنار یا ہے کہ ممکن نہیں یہ نام زبان پر آئے اور
 لوگوں کو منہ نہ آجاسکے۔ مگر شاؤد نادور ہی لوگ جاسنتے ہوں گے کہ یہ کون بزرگ
 تھے۔ اور اُن کے اصلی حالات کیا ہیں۔ بہت سے لوگوں کے تو ذہن نشین ہوگا
 کہ یہ ایک بالکل فرضی اور قصہ گو یوں کا بنایا ہوا نام ہے۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔
 یہ ایک بڑے بزرگ شخص تھے۔ اور گو اُن کے اصلی واقعات بھی مذاق سے
 خالی نہیں مگر اُن کے ساتھ ایسی ملاجست گزرا میسہی کہ داستان کہنے والوں نے
 کر رکھی ہے ایک بڑی گستاخی و بے ادبی ہے۔ دگلدار کی ہمیشہ کوشش رہی کہ لٹریچر
 پیر و ن اور ناموروں کے حالات جہاں تک ممکن ہو صحیح طور پر بتا دے جائیں تاکہ
 انتشار و دزدی کی دنیا سے جہالت دور ہو۔ لہذا جس طرح حاتم طائی یقیس عامری۔
 اور زناش عجم نامی کے حالات وقتاً فوقتاً بتائے جاتے ہیں اُسی طرح اس پرچہ میں
 ہم جناب عمر عیار کے حالات بیان کرتے ہیں جن کی ذمیل کی وسعت شعرا کے خیال
 سے زیادہ اور قصہ گو یوں کے وہم و گمان سے بڑھ کے بتائی جاتی ہے۔

یہ ایک معزز و فخرم صحابی رسول امجد صلعم تھے جن کا اسم گرامی عمرو بن
 امیہ الضمری ہے۔ عمر کو جہالت لئے عربیایا۔ اور جو کیرکٹرن اُن کے لئے قصہ میں
 بنایا گیا تھا اُس کی مناسبت سے اُن کو عیار کا لقب دے دیا گیا۔ اور اسی لقب
 کی بنیاد پر داستان گوؤں میں عیاری "قادر الکلامی و فصیح البیان کا ایک فن
 قرار پا گیا۔

عمرو بن امیہ الضمری جاہلیت ہی میں قتل و غارت۔ اچانک جا پہنچے۔
 اور پھر تیلہ بن سے کسی کو قتل کر کے کھکب جاسنے میں شہرت رکھتے تھے۔ اہل
 قریش کے بڑے بڑے لوگ ان کی صورت سے ڈرتے اور گجراتے تھے۔ جب قوشر
 نے سرور کائنات جلد اسلام کو بہت ستایا۔ اور آپ کو مدینہ کے گوشہ حاضرت میں

بھی بیٹھنا دستور کر دیا تو آپ نے عمرو بن أمیۃ الغمری کو حکم دیا کہ اپنے ساتھ ایک انصاری شخص کو لے کے جاؤ۔ اور کسی حکمت سے ابوسفیان بن حرب کو قتل کر ڈالو۔ اس لئے کہ ابوسفیان ہی تمام قریش کو ابھار ابھار کے آپ کی دشمنی پر آمادہ کر رہے تھے۔ ابوسفیان اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور حضرت رسالت کے خلاف مکہ میں جتنے جھگڑے پیدا ہوتے تھے سب انہیں کو سبب پیدا ہوتے تھے اگرچہ یہ کام دشوار تھا مگر پیغمبر خدا صلعم کے حکم میں تامل کرنے کی کسے مجال تھی۔ ذرا تامل اپنے ایک لوٹ اور ان انصاری صحابی کو ساتھ لیا۔ اور چل کھڑے ہوئے۔ ان بچارے انصاری کے پاؤں میں کچھ شکایت تھی چل نہ سکتے تھے اس لئے انھیں بھی اپنے اونٹ پر بٹھالیا۔ اور ارض بطحا کا رخ کیا۔

جب مکہ کے قریب بطن ارجع میں پہنچے تو اونٹ سے اتر کے اسے ایک گھائی میں جہان تک کسی کا گزر کم ہو سکتا تھا باندھ دیا۔ اور اپنے انصاری رفیق سے کہا "اب ہم چلتے تو ہیں۔ مگر تم میرے تعلق کسی متم کاغذ شدہ دیکھنا تو بے تامل جھاگ کے یہاں چلے آنا۔ اور اونٹ پر سوار ہو کے مدینہ واپس چلے جانا۔ اور جو کچھ تمہارے سامنے گزری ہو اسے بلا کم و کاست بارگاہ رسالت میں عرض کر دینا۔ تم میری فکر نہ کرنا۔ کیونکہ میں مکہ کے راستوں اور گلی کوچوں سے بخوبی واقف ہوں۔ جیسی پیش آئے گی ویسا ہی کروں گا۔" اس باہمی قرار داد کے بعد دونوں روانہ ہو کے مکہ میں داخل ہوئے۔ عمرو بن أمیۃ کے پاس ایک خنجر تھا جسے وہ کپڑوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور دل میں تھی کہ کسی نے خراست کی تو اسے اسی خنجر سے ڈھیر کر دوں گا۔

مکہ میں داخل ہونے کے بعد انصاری رفیق نے عمرو بن أمیۃ سے کہا "اب یہاں آنا ہوا ہے تو آؤ چل کے کعبہ کے گرد طواف کر کے حرم میں دو رکعتیں پڑھ لیں۔" عمرو نے کہا "چلو۔ مگر یاد رکھو کہ قریش لوگ مجھے بخوبی پہانتے ہیں وہ سب حرم کے رخ پر اپنے مکافون کے معنوں میں بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ کسی نے بھی دیکھ لیا تو قیامت ہو جائے گی۔ لیکن خیر جو کچھ ہو چلو تو سہی۔" اس کو بعد دو ٹونے کعبہ کے قریب پہنچ کے اس کے گرد سات طواف کئے۔ دو رکعتیں

پڑھیں۔ اور عبادت سے فارغ ہو کے واپس چلے تو ایک مقام پر گزر رہا جہاں چند قریش بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اٹھا رہے تھے۔ عمرو کی صورت دیکھتے ہی ایک شخص پہچان گیا۔ گہرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بے تحاشا چلایا۔ "ہذا عمر بن امیہ الغمری" غل سننے ہی جو انان قریش چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ یہ حالت دیکھتے ہی عمرو نے اپنے رفیق سے کہا "میں نہ کہتا تھا، خیر اب جہاں تک بھاگا جائے بھاگو۔ ابوسفیان کا ہاتھ آنا تو محال ہے۔ لیکن اگر میرا ساتھ چھٹ جائے تو تم بے تکلف گھاٹی سے اونٹ پر بیٹھ کے مدینہ چلا جانا اور میرا انتظار نہ کرنا۔ میں اپنی آپ خیمہ لون گالا عرض یہ دونوں بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور قریش نے جمع ہو کے کہا "اگر عمرو بن امیہ آیا ہے تو کوئی نہ کوئی آلت ڈھائے گا۔ وہ آدمی نہیں بلائے بلے در مان ہے"

عمرو اپنے انصاری رفیق کے ساتھ بھاگے تو مکہ کے باہر ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ وہاں خوش قسمتی سے ایک غار مل گیا جہاں دین و دونوں گھس کے بیٹھ رہے۔ رات وہیں کاٹی۔ اور منتظر تھے کہ ہماری تلاش کا جوش ٹھنڈا پڑے تو نکل کے آگے کا قصد کریں۔ کہ قریش میں سے عثمان بن مالک بھی اپنے گھوڑے پر سوار اُس پہاڑ پر آیا۔ اور غار کے دہانے کے پاس ٹھہر کے سو بھونگا کہ اندر جا کے بھی تلاش کروں یا نہیں۔ وہ اسی فکر میں تھا کہ عمرو بن امیہ نے چپکے سے نکل کے اچانک اُس کے سینے پر خنجر کا ایک ایسا بھر پور ہاتھ مارا کہ خنجر درتہ تک اندر آگیا۔ وہ تورا کے دھم سے گرا اور پیچہ اپنے غار کے اندر لٹھے۔ عثمان بن مالک نے گرتے وقت ایسی چیخ ماری کہ قریش آہو پئے۔ اور اُسے مقتول دیکھ کے کہا "ایں۔ یہ تمہیں کس نے مارا؟" اُس نے جواب دیا کہ عمرو بن امیہ غمری نے۔ اور اتنا کہتے ہی دم توڑ دیا۔ یہ نہ بتانے پایا کہ عمرو بن امیہ نے مارا تو کہاں سے آئے مارا اور مارا تو مار کے کہاں چلے گئے۔

قریش کو اس سانحہ کا اتنا بڑا صدمہ ہوا کہ عثمان کی لاش اُٹھا کے لیجانے اور اُس کے تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے۔ اور ان دونوں رفیقوں کو اور دونوں تک اسی غار میں چھپے بیٹھے رہنے کا موقع مل گیا۔ ان دونوں میں ان کی

سلاش کے طرے سے بھی قریش کا خیال نہیں کیا تھا۔ تیسرے دن دونوں غار سے نکل کے مقام تقسیم کی طرف چلے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ خبیث نام کے ایک معزز شخص کا یکچوبہ خیمہ نصب ہے۔ اور گرد اگر دو لوگ پہرہ دے رہے ہیں۔ عرو نے انصاری رفیق سے پھر کہا کہ ”دیکھو اگر میرے متعلق کوئی اندیشہ نظر آئے تو تم بھاگ کے مدینہ چلے جانا“ اور یہ کہہ کے اس خیمہ میں گھس کے خبیث کو اس طرح مار ڈالا کہ اس کی لاش کا بھی کسی کو پتہ نہ لگا۔ اور اس کے خیمہ کی چوب کو بیٹھ کر اٹھا کے لے بھاگے۔ لوگوں نے تعجب کیا۔ تو چالیس قدم پر جا کے خیمہ کی چوب پھینک دی اور اس زنگٹے سے بھاگے کہ کسی نے گرد بھی نہ پائی۔ آخر وہ لوگ عاجز آ کے واپس گئے اور انھوں نے جو بٹ کے دیکھا تو ان کے انصاری رفیق کا پتہ نہ تھا۔ وہ بھلا ان کے ساتھ کیا دوسرے ہوتے؟ انھوں نے راستہ ہی سے واپس جا کے بارگاہ رسالت میں کیفیت عرض کر دی اور سب کو عربین امیہ غمری کی زندگی سے یاس ہو گئی۔

عربین امیہ یہاں سے آگے چلے تو کوہ فہمان کے ایک غار میں گھس کے دم لیا۔ وہاں یہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور تیر و کمان سامنے رکھے ہوئے تھے کہ ایک شخص بھیڑیا بن جراتا ہوا آیا۔ اور دھوپ سے بچنے کے لئے اس غار میں گھسا۔ یہ ایک لمبا بڑا لنگڑا جوان تھا اور ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی انھوں نے کہا ”تم کون؟“ اس نے کہا ”میں قبیلہ بنی ذیل ابن بکر سے ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟“ عرب بولے ”مجھے نہیں جانتے! میں بھی تو ذیلی اور بکری ہوں“ وہ ہم قبیلہ تصور کر کے خوش ہوا۔ بولا ”خوب ملے“ اور ان کے پاس آ کے لیٹ گیا۔ پھر لیٹے ہی لیٹے اس نے یہ شعر کا شروع کیا۔
 وَكُنْتُ بِمُسْلِمٍ مَا دُمْتُ حَيًّا
 وَكُنْتُ إِدْنِ دِينِ الْمُسْلِمِينَ
 (جب تک زندہ ہوں مسلمان نہ ہوں گا۔ اور نہ مسلمانوں کا دین اختیار کروں گا۔)
 اس کا یہ شعر سن کے انھوں نے دل میں کہا ”اچھا سمجھا جائے گا“ تھوڑی دیر میں وہ کاتے کاتے سو گیا۔ اور انھوں نے موقع پاتے ہی اسے مار ڈالا۔ کچھ ایسے برہم تھے کہ اس کی وہ آنکھ جو صحیح و سالم تھی تیر گھیر کے نکال ڈالی۔

اور چلتے ہیں۔ اب مدینہ کی طرف ایک تیز پر جڑیا کی طرح اڑتے چلے جاتے تھے کہ کچھ فاصلہ برداشت کر لیں۔ جب وہ قریب آئے تو انھوں نے پہچانا۔ اور سمجھ گئے کہ مشرکین مکہ کے جاسوس ہیں جنہیں انھوں نے رسول احمد صلعم کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ آپ غور آپک کے ان کے قریب گئے اور کہا "سنئے ہو؟ تم دونوں ہمارے قیدی بن جاؤ" ان دونوں نے حیرت سے ان کی صورت دیکھی۔ اور بولے "وہ؟ ہم وہیں اور تم اکیلے ہو؟ اس جواب کے ساتھ ہی آپ نے عجب پھرتی کے ساتھ کمان سے تیر جوڑ کے جو مارا تو تیر بہت تھا۔ ایک شخص گبر کے تڑپنے لگا۔ اور آپ نے دوسرے سے کہا "اب تو دونوں جانب ایک ہی ایک شخص ہے۔ بس کہتا ہوں کہ میرے قیدی بن جاؤ" ان کی یہ بھرتی اور شجاعت دیکھ کے وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ لے اختیار ہتھیار ہاتھ سے چھوٹ پڑے۔ اور بولا "آئیے مجھے گرفتار کر لیجئے" انھوں نے جا کے اس کے ہاتھ کا انگوٹھا اپنی کمان کی تانٹ سے خوب کس کے باندھا۔ اور اسے کھینچتے ہوئے مدینہ کی طرف چلے۔

مدینہ قریب ہی رہ گیا تھا۔ مقوڑے سفر کے بعد داخل مدینہ ہوئے۔ یہاں لوگوں کو ان کی زندگی کی امید نہ تھی اور ان کے مرنے کی خبر اڑ چکی تھی۔ چند انصاف نے جو نہیں ان کی صورت دیکھی بے اختیار خوشی سے جلا اٹھے۔ عمر بن امیہ الضمری آگئے یہ آواز گلی کو بچے کے کھیلنے والے لڑکوں نے بھنی تو خوش خوش دوڑے ہوئے رسول احمد صلعم کی خدمت میں گئے۔ اور عرض کیا "یا رسول احمد عمر بن امیہ الضمری آگئے آپ یہ خردہ سن چکے تھے کہ خود عمر و اپنے قیدی کو پہنچتے ہوئے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ آپ ان کو اس وضع قطع اور اس حالت میں دیکھ کے بہت ہنسے اور کیفیت پوچھی۔ انھوں نے ساری سرگشت اول سے آخر تک سنا دی۔ اور حضرت سرور کائنات نے خوش ہو کے انہیں وعائے خیر دی۔

جو کتا بین صحابہ کے حالات میں ہیں ان کے دیکھنے سے غالباً عمر بن امیہ الضمری کے کچھ اور حالات بھی معلوم ہو سکیں گے۔ مگر تب تاریخ و سیر میں ان کا

یہی واقعہ زیادہ مشہور ہے۔ اور یہی واقعہ ہے جس کی بنیاد پر یہ عرب بن امیہ سے
عمر بن عبدالمطلب سے گئے۔

قیس و لبنی

ختمِ سلطہ کے ساتھ ہم اپنا ایک نیا ناول قیس و لبنی پبلک کے دربار میں
پیش کرتے ہیں۔ اس میں عربی مذاق اور عربی معاشرت کے مختلف نمونے دکھائی
دے گا۔ ساتھ ایک پیچھے عاشق عرب کے نفس الامری واقعات اور دسے گئے
ہیں۔ اگرچہ ہمارے ناول تاریخی ہیں۔ مگر پھر بھی ان میں ناول کا پلاٹ درست کرنے
کے لئے کچھ نہ کچھ تعریف کر کے تاریخ کو بدلنا ہی پڑا ہے۔ بغلات ان کے اس میں
یہ خاص بات ہے کہ قیس بن زریح کے جو کچھ واقعات تھے سب ایک عمدہ ترتیب
سے باہم منسلک کر دئے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گفتگو کا سلسلہ بنایا ہوا
ہے مگر اس کے ساتھ یہ کہنے کی بھی جرأت کی جاسکتی ہے کہ حسنِ حقیقی پر نقطہ نقاشی
اور رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ اور بس۔

ابتداءً قیس کا قصہ لب ہو کے بنی کعب میں جانا۔ لبنی کا پانی پلانا۔ اور لبنی کی
صورت دیکھتے ہی قیس کا اس پر عاشق ہو جانا۔ اس کے بعد اس کی سرگردانی و
پریشانی۔ پھر جنابِ امام حسینؑ کی سعی سے عقد ہونا۔ اور خود جنابِ امام کا زرمہرا و افزانا
پھر اولاد ہونے سے اور نیز ان کے باہمی و فوری عشق کو دیکھ کے قیس کی مان کا
برہم ہونا اور آخر قسم کھا جانا کہ جب تک قیس لبنی کو نہ طلاق دے گا میں نہ سائے
میں بیٹھوں گی اور نہ بستر پر سوؤں گی۔ ایک مدت تک روزیہ معمول رہنا کہ قیس
اس پر اپنی چادر سے سایہ کئے رہتا۔ اور آخر زندگی سے تنگ آکے لبنی کو طلاق
دینا۔ پھر اپنے اس فعل پر ندامت و انوس۔ جو شِ عشق کا بڑھنا۔ بنی عذرہ کی رکاوٹ کا
چھڑنا۔ اور آخر قیس کا بیمار پڑنا۔ طبیب کا آنا۔ اور یہ مشورہ دینا کہ قیس کو اس کی
طبیعت پر چھوڑ کے قبائل عرب میں پھرتے اور دورہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ شاید
اس طریقہ سے وہ لبنی کو بھول کے کسی اور لڑکی پر فریفتہ ہو جائے۔ آخر اسی سفر کے

بدولت بنی خزارہ کی لبنی سے اس کا عقد ہو جانا۔ اور اس عقد کی خبر سن کے لبنی کعبہ کا یہ حکم امیر معاویہ خالد بن غلدہ غطفانی سے عقد کر لینا۔ یہ سن کے قیس کا مجنون ہو کے دشتِ پیمانی کرنا۔ عبد امہ بن عباس کا اُس سے ملنا۔ پھر اُس کا مجنون عامری سے جا کے ملنا۔ اُس کا پیام لے کے لیلیٰ کے پاس جانا۔ اور لیلیٰ کا شکایت کرنا کہ مجنون اپنے اشار میں کہتا ہے کہ میں اُس سے ملنے کو گئی تھی بھلا اُس سے پوچھو تو کہ میں کب آئی تھی۔ پھر مجنون کو اس جواب سے مطلع کر کے مدینہ کی راہ لینا۔ راستہ میں لبنی کے شہر ہر خالد سے ملنا۔ اُس کا اونٹ خریدنا۔ اور مدینہ میں کثیر بن صلت کے مکان پر بلانا۔ اور وہاں روپیہ دے جلنے کے بعد لبنی کا اُسے پہچاننا اور کہنا کہ یہ تو قیس ہے۔ پھر حضراتِ حنین کی کوشش سے خالد کا اُسے طلاق دینا۔ مردان کی مخالفت۔ اور قیس کا دربارِ مویہ میں جا کے کامیاب واپس آنا۔ دوسری طرف بنی خزارہ کی لبنی کا اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں آنا۔ اور آخر قیس و لبنی کا دوبارہ عقد ہونا۔ اور دوسری لبنی کا بھی باجوہ اختیار ملنے کے قیس ہی کے پاس رہنے کو پسند کرنا یہ سب واقعات ہیں اور تاریخی ہیں۔ اور ہم نے اتنا بھی تصرف نہیں کیا جتنا کہ مجنون عامری کے حالات بیان کرنے میں اکثر مثنویوں میں کیا گیا ہے۔ عرب میں قیس کو دوسرے عاشقِ عرب مجنون عامری کے مقابل میں زیادہ شہرت حاصل تھی عاشقِ لیلیٰ مجنون کا نام قیس نہ تھا بلکہ اُس کا صحیح نام عامر تھا۔ اگرچہ ضعیف روایتوں سے اُس کے اور نام بھی ثابت ہوتے ہیں۔ اور اُس کے باپ کا نام ملوٹ تھا۔ مگر فارس والوں نے عاشقِ لبنی قیس کا نام اُسے دے کے اُس کے باپ کا نام عامر بتا دیا۔ جو کہ دراصل خود اُسی کا نام تھا۔

بہر حال ہم نے اس ناول کے ذریعہ سے ایک ایسے عاشقِ عرب کے حالات اردو پبلک میں پیش کر دیے ہیں جو مجنون عامری سے زیادہ شہرت کا مستحق ہے۔ اور جس کی مشرقِ لبنی دراصل لیلیٰ سے زیادہ صاحبِ جمال تھی۔ اس ناول کی قیمت حسبِ معمول چھ روپے کلدار یا چھ روپے محبوبہ مقرر کی گئی ہے۔ ناولوں کے شایعین اور ہمارے قدر افزاء جلد توجہ فرمائیں۔ اس لئے کہ اب کی مرتبہ اشاعت و گلزار سے بھی ہوئی تھوڑی ہی جلد میں رہ گئی ہیں۔

آغا خان صاحب

دوسری کتاب جو اسی مسئلہ کے ساتھ تکمیل کو پہنچی مندرجہ عنوان کتاب ہے جس میں لکھنؤ کے امیر اعظم مرزا آغا علی خان عرف آغا خان صاحب کے حالات زندگی عمدہ ترتیب اور تہذیب اسے جمع کر دئے گئے ہیں۔ آغا خان صاحب ان نامی گرامی لوگوں میں تھے جنھوں نے عہد شاہی کو بھی دیکھا اور عہد برطانی کو بھی۔ اور اس کے ساتھ خوبی یہ کہ دونوں متخالف و تباہ کن دوروں میں ممتاز و ممتاز رہے۔ شاہی مین آدمی ریاست اور وہ کے ناظم یا کشر تھے۔ اور انگریزی عہد میں شہر کے ایک صاحب ثروت و اثر امیر اور حکام و محکومین دونوں کے معتد علیہ۔ اور درحقیقت وہی تھے جنھوں نے نئے بڑے حکام کے دلوں کو خستہ و خراب رعایا اور تباہی زدہ شاہراہوں اور نواب زادوں کی طرف سے صاف کیا۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ان کی دستگیری کی۔ اگرچہ آغا خان صاحب کے نام سے دیگر اقطار ہند کے لوگ واقف نہیں اور شاید انھیں خیال ہو گا کہ ایک ایسے شخص کے حالات زندگی میں کیا لطافت آسکتا ہے جس سے وہ بالکل نا آشنا ہوں مگر انھیں اگر دنیا میں ترقی کرنا ہے تو ان لوگوں کے حالات ضرور پڑھیں جنھوں نے دنیا میں اپنے لئے ترقی کا راستہ خود ہی بنایا ہے۔ اور محض اپنی قوت بازو سے امج کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ اگرچہ ہم نے ایک ایسے نامور شخص کو جس کی شہرت اس کے وطن اور اس کے شہر ہی تک محدود تھی شہرت عام کے دربار میں انٹروڈیوس کیا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ جس قابل شخص کو ہم نے اس اعلیٰ درجہ میں پیش کیا ہے وہ ہر طرح اس کا مستحق ہے۔ اور اس قابل ہے کہ ہر جگہ کے نوجوان ترقی کے میدان میں قدم رکھتے وقت اس کے حالات و واقعات کو اپنی نظر کے سامنے رکھیں۔ اور ان سے سبق لیں۔ اس کی قیمت ایک سو روپیہ کلداریا سو روپیہ عمر سکہ عالی ہے۔

جناب مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شہر کی تصانیف

تاریخ		جلد	صفحہ
۱	۲		
۱	جہانگیر نامہ	۱۰	۱۰۰
۲	ابو بکر شبلی	۱۹	۱۰۰
۳	عروب صلیبیہ	۳۰	۱۰۰
۴	تاریخ شاہ جہاں		
۵	ایضاً دوم		
۶	خواجہ معین الدین چشتی		
۷	اسلامی سوانح غری		
۸	مار و بیک		
۹	افسانہ نقیس		
۱۰	تاریخ بغداد		
۱۱	ملکہ زبور		
۱۲	الحکم زنا عید (جہانگیر)		
۱۳	اخلاق نین (صاحب)		
جلد دوم		جلد	صفحہ
۱۴	۱۵		
۱۴	جلد دوم	۱۴	۱۰۰
۱۵	جلد دوم	۱۵	۱۰۰
۱۶	جلد دوم	۱۶	۱۰۰
۱۷	جلد دوم	۱۷	۱۰۰

ناول

۱	۲	۳	۴
۱	قیس و لبنی	۲۱	۱۰۰
۲	یوسف و خدیجہ	۲۲	۱۰۰
۳	ایام عرب ہر دو جلد	۲۳	۱۰۰
۴	فرود سن برین	۲۴	۱۰۰
۵	شو قین ملکہ	۲۵	۱۰۰
۶	ملکہ الفزیر ورجنا	۲۶	۱۰۰
۷	منصور مہنا	۲۷	۱۰۰
۸	حسن آغا	۲۸	۱۰۰
۹	شہید وفا	۲۹	۱۰۰
۱۰	گریشن ہندی	۳۰	۱۰۰
۱۱	پدر امنا کی	۳۱	۱۰۰
۱۲	صیدت	۳۲	۱۰۰
۱۳	آغا صادق کی	۳۳	۱۰۰
۱۴	شاوی	۳۴	۱۰۰

محمد فاروق منیر دکن دار حساب آباد کن فیلیمانہ

